محمد حیات خان سیال

شیر بے کلا

منتخب داستانہائے محمد حجازی

مترجم

محمد حیات خان سیال

نذر سنز پبلشرز سرکلر روڈ لاہور

طبع اوّل ۱۹۷۹ء
ناشر .... ایس ایم شفیق
طابع .... طفیل آرٹ پرنٹرز لاہور
کتابت .... سلطان بیگ ظفر علی
قیمت .... ۶ روپے

تعارف

جہاں تک ایران کی مقصدی و معنوی صحافت کا تعلق ہے محمد حجازی کا مقام ایران کی ادبی تاریخ کے بلند ترین اور اعلیٰ ترین مقامات میں سے ہے۔ حجازی کی شیریں بیانی کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم ملک الشعراء نے نہایت صراحت سے کہہ دیا ہے کہ اگر میں حجازی جیسی شیریں رواں اور دل گداز نثر لکھ سکتا تو شعر کہنا ترک کر دیتا۔

حجازی مغرب کی قدیم و جدید ادبیات اور افکار سے بخوبی آشنا ہے اور غالباً یہی آشنائی ہے جس نے حجازی کو محافظہ کاری پر مجبور کیا ہے۔ حجازی نے بھی دیگر ژرف نگاہ ادباء کی طرح محسوس کیا کہ ہمارے بااصطلاح جدید ادیب و شاعر بے راہ روی اور انحراف کو تجدّد اور ابتکار کے مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ حجازی کے آثار ادبی اور لسانی اعتدال اور میانہ روی کا بہترین نمونہ ہیں ان کی قصہ گوئی کا مقصود تہذیب اخلاق اور تطہیر فکر ہے اور ایران ایسے ترقی پسند ملک میں آثار حجازی کی بے نظیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی اس بات کا ثبوت ہے کہ اہلِ مشرق کے دل کی گہرائیوں میں ابھی تک قدیم اور آزمائی ہوئی قدروں کا احترام ہے۔

میں حجازی کی منتخب داستانوں اور پری چہر کے اردو ترجمہ کو دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان اِستحکامِ روابط کا ایک مفید ذریعہ خیال کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر عبد الحمید عرفانی)

(سابق پریس اتاشی سفارت پاکستان در ایران و مدیر سہ ماہی ہلال)

راحت کے نام

۲۳؍ ۱۹۱۰

ترتیب

حصّہ اوّل

حصّہ دوم

آقائے محمد حجازی

پیدائش ۱۹۰۰ء

وفات ۱۹۷۱ء

آثار

ہما - آئینہ - پری چہرہ - زیب پروانہ - آہنگ سرشک - اندیشہ - راز پنہاں - نسیم - ساغر سخنان جاوید۔

آقائی حجازی ایرانِ حاضر کے مشہور و معروف ناول نویس و افسانہ نگار ہیں ان کی داستانیں اپنی بھرپور شعریت کی وجہ سے ادب کے رنگیں اور دلچسپ مرقعے پیش کرتی ہیں۔ ان میں زندگی کی شیرینی بھی ہے اور تلخی بھی ہے۔ اور ان دونوں کا حسین امتزاج حجازی کا فن ہے۔

محمد حیات خان سیال،

شیریں کلا

میرا ایک دوست ہے ۔ کچھ دن ہوئے اُس نے مازندران میں کچھ جائداد خرید لی ہے ۔ اصرار کر رہا تھا کہ دو تین دِن کے لئے گاؤں چلیں اور وہاں جا کر ذرا دنیا کی فکروں سے آزاد ہوں تاکہ سکون و آرام میسّر ہو ۔ کہنے لگا ۔ تڑکے ہی یہاں سے چل پڑیں گے ۔ دوپہر تک شیریں کلا پہنچ جائیں گے ۔ باقی دن ، کل اور پرسوں وہاں رہ کر تفریح کریں گے ۔ اور جب چاہو گے واپس چلے آئیں گے ۔ شیریں کلا کی جتنی بھی وہ تعریف کر سکتا تھا اُس نے کی ۔ بے حد حسین اور خوبصورت جگہ ہے ۔ مفرح اور رُوح پرور آب و ہوا اور دلفریب مناظر ۔ میں ان دنوں سفر کے نام سے بھی کوسوں دُور بھاگتا ہوں اور کسی جگہ کو بھی اپنے گھر کے گوشۂ عزلت سے بہتر نہیں سمجھتا ۔ لیکن کیا کروں دوست کے کہنے کو بھی تو نہیں ٹال سکتا تھا اور واقعی اُسے حق بھی پہنچتا تھا چونکہ میں بھی تو اکثر و بیشتر اُسے اپنی لکھی ہوئی کہانیاں سنایا کرتا ہوں اور وہ میری خاطر بڑے اِنہماک سے سُنتا رہتا ہے ۔

ہم صبح سویرے چلے لیکن گاڑی راستہ میں بگڑ گئی اور دِن چھپے شیریں کلا پہنچے ۔ کافی تھک چکے تھے ۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گئے ۔ دوسرے دِن صبح ، ابھی سُورج نِکلا بھی نہ تھا کہ ہم ایک دریا کے کنارے کھڑے تھے نیند سے بوجھل آنکھیں اور ذوقِ نظارہ میں ڈوبے ہوئے آسمان میں ایک سیاہ چادر آہستہ آہستہ سمٹ رہی تھی ۔ ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور ٹمٹما ٹمٹما کر کہیں چھُپ جاتے تھے ۔ پہاڑی چوٹیاں چمکنے لگی تھیں ۔ نُور کی سفید چادر بچھی جا رہی تھی ۔ سیاہ پردے جو پانی پر پڑے ہوئے تھے اور پانی کے شور کو اور بھی ڈراؤنا بنا رہے تھے ، آہستہ آہستہ دھُندلے ہوتے چلے گئے اور پھَٹ گئے ۔ مازندران کے بھُوت پریت جن کے متعلق شاہنامہ میں پڑھا تھا سب کے سب گرانڈیل پہاڑوں ، اُونچے درختوں اور گہری وادیوں کی صُورت تبدیل ہو گئے ۔

جی نہیں چاہتا تھا کہ پلک بھی جھپکوں ۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مستقل دیکھتا رہا ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس سحر آمیز مصوری کی کوئی جھلک دیکھنے سے رہ جائے ۔ رنگ بکھرے پڑے تھے اور اِن رنگوں میں عجیب و غریب نقش و نگار اُبھر رہے تھے ۔ میں دیکھ رہا تھا اور حیران و مبہوت کھڑا تھا جیسے کسی طوفان میں گھِر گیا ہوں ۔

اور جب سورج چمکا اور دُنیا روشن و منوّر ہوگئی تو میں نے دیکھا کہ پہاڑی چوٹیوں پر دُھوپ چھاؤں کا کھیل ہو رہا ہے۔ سرسبز چوٹیاں سبز مخمل کی طرح نسیمِ صُبح کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہک رہی ہیں۔ کبھی روشن ہو جاتی ہیں اور کبھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ پہاڑی درختوں پر جھُومتے ہوئے درخت اِس طرح ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے ہیں جیسے آپس میں راز و نیاز اور سرگوشیاں کر رہے ہوں کہ رات کے بھیدوں کو نہ کھولیں گے۔ دریا کے دونوں طرف اور جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی زمین کی پستیوں اور بلندیوں پر رنگارنگ پھولوں کے فرش بچھے ہوئے تھے۔ سُرخ پھُولوں کے درمیان، جو ہوا کے تیز جھونکوں سے سہم سہم کر ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو رہے تھے، ایک نیا گل کھِلا تھا۔ ایک بڑا سا گلِ آتشیں: ایک بڑا پھول، جس میں سے آگ کے شعلے نِکل رہے ہوں، بدن چُرائے، لباس سمیٹے اِدھر اُدھر لپکتا پھر رہا ہے، کبھی اِس پھُول پر کبھی اُس پھُول پر۔ اور رہ رہ کر ایک ہاتھ سے اپنے لمبے غرارہ کو جو ہوا سے اُڑ اُڑ جاتا تھا اپنی پنڈلیوں تک لے جاتا تھا۔

وہ ڈھیلے ڈھالے سُرخ لباس والی لڑکی چونکہ بہت دُور تھی اچھی طرح نہ دیکھ سکا کہ صُبح سویرے سبزہ و گُل کے درمیان کیا کر رہی ہے۔

میرے دوست نے بھی زبان کھولی اور چراگاہوں، دھان کے کھیتوں اور ریشم کے کیڑوں کی پرورش گاہوں کی بات چیت کرنے لگا۔ وہ بولے چلا جا رہا تھا اور مجھے کچھ پُوچھنے کی مُہلت بھی نہ دیتا تھا۔ میں نے بھی اُس کی ان باتوں پر کان نہ دھرا اور محوِ نظارہ اپنے خیالات میں کھویا رہا اور دِل ہی دِل میں کُڑھتا رہا۔ کاش میرے ساتھ کوئی صاحبِ ذوق بھی ہوتا جو میرے دل کی باتیں سُنتا، سمجھتا اور اُسے میں اپنے دل کا حال سُنا سکتا۔ میرا دل شعر و نغمہ کے لئے تڑپ رہا تھا۔ یکایک ایک گلے کی غمگین اور رُندھی ہوئی آواز بلند ہو کر پہاڑیوں سے ٹکرائی اور اِس کی صدائے بازگشت سے وادیاں گونج اُٹھیں اور فضا ایک ایسے شور سے معمور ہوگئی جیسے آسمان کے معبدوں میں ناقوس بج رہے ہوں۔

دِل مچلنے لگا۔ آنکھیں بند کر لیں تاکہ دوبارہ اِسی دلکش نغمہ کو سُن سکوں۔ اس مرتبہ ایک مخصوص آہنگ اور اُونچے سُروں میں ایک ایسی ہی آواز دوسری طرف سے آئی جیسے پہلی آواز کا جواب آیا ہو۔ پھر تو دونوں طرف سے نالے بلند ہونے لگے۔

بے اختیار ہو کر میں نے اپنے دوست سے پُوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہیں یہ؟"

اُس نے متعجب ہو کر کہا۔ "سچ مچ نہیں جانتے کیا تُم تو اہلِ دل ہو!"

مَیں نے جواب دیا "ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ حقیقت معلوم کروں"۔

دوست نے مُنہ کھولا ہی تھا کہ کچھ کہے لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ اُس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "خاموشی سے سنو!"

ایک لطیف اور دلکش نغمہ سُنا، جس کی لَے ہوا چلنے سے پنچم اور مدھم سُروں کے درمیان بھٹک رہی تھی۔ میں اس نغمہ کے بول تو نہ سمجھ سکا لیکن دوست کی مسکراہٹ اور سر کے اِشاروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شعر و نغمہ کو خُوب سمجھتا ہے وہ نغمات سُن سن کر مسکراتا جاتا تھا اور ان کی تانوں پر سر دُھن رہا تھا۔ آہستہ سے اُس نے ڈھیلے ڈھالے لباس والی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "لیلیٰ

ایک عاشقانہ گیت گا رہی ہے۔ گایوں کے شاعرانہ اور غنائیہ سوال و جواب سُن کر اُسے بھی محبت کی کسی بھولی بسری یاد نے تڑپا دیا ہے۔ یہ گیت مجھے اچھی طرح آتا ہے"

جونہی کہ لیلی کا گیت ختم ہوا۔ ایک نرم اور رسیلی آواز فضا میں گونجی۔ دوست نے مجھے بتایا کہ یہ جو جواب دے رہا ہے اس کا نام مُراد ہے اور لیلی پر بُری طرح فریفتہ ہے۔

میں نے کہا" بات نہ کر۔ ذرا سُننے دے۔"

مُراد گا رہا تھا اور گائیں بھی کبھی باری باری اور کبھی ایک ساتھ اپنے نغمے الاپ رہی تھیں۔ پہاڑیاں، وادیاں اور شاید پھول، پتے، سب کے سب اُن نغمات کا جواب دے رہے تھے اور لیلی بھی خاموش نہ تھی۔

میں آرکسٹرا اور سازوں کی نوک جھونک کے معنے اُس روز سمجھا اور میرے عقل و ہوش اور چشم و گوش نے جوشِ محبت اور سوزِ عشق کو خوب اچھی طرح سُنا اور سمجھا۔ میں نے عہد کیا کہ اب سے آرکسٹرا کے ہر ساز کو علیحدہ علیحدہ خوب غور سے سنوں گا اور اُن کے نالہ و فریاد اور اُن کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کروں گا اور سازوں کی بات چیت کو بغیر سمجھے نہ چھوڑوں گا۔

جب یہ داستان ختم ہوئی تو میں نے کہا اب ذرا تفصیل سے مُراد اور لیلی کے عشق و محبت کی کہانی سُنا۔"

کہنے لگا" یہ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہیں اور جان چھڑکتے ہیں۔"

میں نے کہا" تجھے خدا کی قسم سچ سچ بتا کہ ان کی محبت کے راستے میں کون حائل ہے۔ اگر کوئی رکاوٹ ان کے درمیان ہو تو آج ہی دور کر اور ان کی شادی کرا دے۔ محبت کے ماروں کو زندگی بخش۔"

کہنے لگا" افسوس ان کی محبت کا مرحلہ اتنا آسان نہیں۔ ایک تیسرا عاشق اور بھی ہے۔"

"یعنی کیا مطلب؟"

"مُراد اور رستم چچازاد بھائی ہیں جو دونوں لیلی پر مرتے ہیں لیلی بھی دونوں پر عاشق ہے اور ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ آج تک کوئی بھی اِس گتھی کو نہ سُلجھا سکا۔ تین آدمی ہیں جو عشق کی آگ میں سُلگ رہے ہیں، جل رہے ہیں۔ دونوں چچیرے بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ ایک دوسرے کو مار ڈالنے کے لئے کئی مرتبہ کشتی لڑ چکے ہیں اور ایک دوسرے کو زخمی کر چکے ہیں۔ دو مہینے ہونے کو آئے کہ اِن دونوں کے والدین نے آپس میں عہد کیا تھا کہ یہ دونوں کبھی کشتی نہ لڑیں گے۔ یہ لڑکی اور دونوں لڑکے دراصل کرد قبیلہ سے ہیں جو مازندران میں آ بسے ہیں۔"

میں نے کہا" ذرا لیلی کو بلاؤ۔ میں اس سے بات چیت کروں گا۔ بلکہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے عاشقوں میں سے کس پر زیادہ مرتی ہے۔ یا کم از کم یہ معلوم کروں کہ وہ کس کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس صورت میں جس کو وہ زیادہ چاہتی ہے اُس کے ساتھ اس کا بندھن باندھ دیا جائے اور اِس طرح اِن تینوں جوانوں کو اس آگ میں جلنے سے بچایا جائے۔

لیلی آئی اور بڑے متین، سنجیدہ اور متکبرانہ انداز میں میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ لمبا قد، گردن، سینہ، بازو، پنڈلیاں اور اُس کے سارے اعضا ایسے جیسے کہ وہ برسوں سے ورزش کرتی ہو۔ گول مٹول ہو رہی تھی۔ بیضوی چہرہ۔ موٹی اور سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، موٹے ہونٹ اور گالوں کی سُرخی میں، اُس کے بدن کے صاف شفاف اور

زیادہ خون کی جھلکیاں تھیں۔ لمبے، چھتنار اور گھنیرے بالوں کی ایک لٹ کو اُس نے زرد ریشمی رُومال سے باندھ کر گردن میں لپیٹ رکھا تھا۔ اور ہلکے نیلے رنگ کا تنگ کُرتہ پہنے ہوئے تھی۔

میں نے اُس سے کہا "میں نے اِسی نواح میں ایک گاؤں خریدا ہے۔ چاہتا ہوں کہ رستم اور مُراد میں سے کسی ایک کو اس گاؤں کی دیکھ بھال کے لئے کارندہ کی حیثیت سے منتخب کروں۔ تیری نظر میں اِس کام کے لئے کون زیادہ اچھا رہے گا؟"

جیسے وہ میری چال کو سمجھ گئی ہو۔ مسکرائی اور کہنے لگی۔ "میں دونوں کو ایک ہی جیسا سمجھتی ہوں۔"

"اچھا۔ اِن میں سے کون زیادہ طاقتور ہے؟"

"دونوں"

"ان میں سے کون زیادہ مہربان اور اچھا ہے"

"دونوں"

"کون زیادہ خوبرو اور حسین ہے؟"

"تمہارے خود آنکھیں ہیں۔ دیکھ لو۔ میرے لئے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔"

"اچھا یہ بتا کہ اِن دونوں میں سے تجھے کون زیادہ چاہتا ہے؟"

"میں کیا جانوں۔ میں کوئی ان کے دلوں میں تھوڑا ہی بیٹھی ہوں۔ میں دونوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہوں۔ برابر چاہتی ہوں۔ ہم تینوں بچپن ہی سے ایک ساتھ پلے بڑھے۔ یہ میری خالہ کے لڑکے ہیں۔ دونوں میرے ساتھ ہی بڑے ہوئے۔ میں دونوں میں سے کسی کو بھی چھوڑ نہیں سکتی اور دونوں میں سے کسی کی بربادی بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"آخر کیا مطلب ہے۔ جوانوں کو شادی کرنا ہی چاہیئے۔ اِن میں سے ایک کو اپنے لئے پسند کرلے۔ اِس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں۔"

"وہ اپنی شادیاں کر لیں۔ میں شادی نہیں کروں گی۔ یوُں ہی کنواری مروں گی۔"

بغیر اس کے چہرے کا رنگ بدلے، اُس کے رُخساروں پر موتی ڈھلکنے لگے۔ خوُنِ دل تھا جو آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔

میں نے کہا "میں تو یُونہی چھیڑ رہا تھا۔ وہ دونوں بھی شادی نہیں کریں گے۔ ۔ ۔"

لیکن میری حالت اتنی دگرگوں ہو رہی تھی کہ سلسلۂ کلام جاری نہ رکھ سکا۔ اور گھر لوٹ آیا۔

قبیلہ کا سردار آیا اور کہنے لگا۔ "آج ہم خان مالک کی تشریف آوری کی خوشی میں سانڈوں کی لڑائی کا تماشا کریں گے۔"

میں اس سے جھگڑنے لگا "آخر یہ کیا واہیات ہے۔ زمانہ جاہلیت کی اِن وحشیانہ حرکتوں اور بے رحمانہ تفریحوں کو اَب تو ختم کر دینا ہی چاہئیے۔ کتنی افسوسناک بات ہے کہ بے گناہ اور بے زبان جانوروں کو بیدردی سے مارا جائے! یہ اِنسان نہیں ہیں کہ اِن کے دِل طمع، حسد اور بغض وکینہ سے بھرے ہوں اور اپنے وہم وگمان پر بے سبب اور بے کار ایک دوسرے کی جان لے لیں۔ یہ جانور ہم سے کہیں زیادہ عقلمند ہیں، وہ جانتے ہیں کہ سب کو دانہ پانی میسر ہے۔ کھاتے پیتے ہیں اور خُدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور محبت و آشتی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ شیطانی رُوح جو ہم میں ہے آخر ان میں کیوں پھونکی جائے۔ میں یہ تماشا نہیں ہونے دُوں گا۔ دیکھتا ہوں اِنہیں کون لڑاتا ہے۔"

قبیلہ کے چودھری نے ہنستے ہوئے کہا "جناب معلوم ہوتا ہے آپ لڑائی سے ڈرتے ہیں لیکن ہمارا خان بڑا

بہادر اور دلیر ہے۔ اِن چیزوں سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

خان نے کہا "چودھری یہ یونہی مذاق کر رہے ہیں۔ سانڈوں کو ضرور لڑاؤ۔ سب تماشا دیکھیں گے۔ مجھے ان کی لڑائی میں بہت لطف آتا ہے۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے میں لے گیا اور کہا "میرے بھائی۔ میں خود اِس بے رحمی کے تماشہ سے نفرت کرتا ہوں۔ لیکن کوئی چارہ ہی نہیں۔ مجھے یہ تماشہ دیکھنا ہی پڑے گا اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تو گاؤں والے اور یہ سردار مجھے بزدل اور بودا سمجھے گا۔ اِن پر سے میرا رُعب اُٹھ جائے گا۔ اور پھر میرا یہاں رہنا دُوبھر ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تو پھر مُراد اور رستم کو بلواؤ۔ انہیں بھی تو دیکھوں۔"

تھوڑی دیر بعد رستم آیا۔ شاہنامہ والے رستم کی سی داڑھی اور سینگوں والی ٹوپی تو نظر نہ آئی لیکن یہ وہی جوان رستم تھا جس نے مرکھنے ہاتھی کو مار کر قلعۂ سفید پر قبضہ کر لیا تھا۔ لمبا قد، چوڑا سینہ اور تنگ کمر۔ علین میں وہی تھا جس کی تعریف میں گیت گائے گئے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ رستم بھی ایسا ہی گبھرو تھا۔ کیا اس کے چشم و ابرو اور لب و دندان بھی ایسے ہی حسین تھے؟ کیا وہ بھی ایسا ہی بانکا نوجوان تھا؟

رستم کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور وہ پورے بیس سال بھر کر اکیسویں میں پڑ چکا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں نے پوچھا "ہاں تو شادی کرنے کا کب ارادہ ہے۔ عمر بیتی جا رہی ہے۔ آخر جلدی کیوں نہیں کرتے۔"

"اگر میرے بس میں ہوتا تو دو برس پہلے ہی لیلا سے شادی کر لیتا لیکن کیا کروں وہ مُراد پر مرتی ہے۔"

"نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ ایسا نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ اگر وہ تجھے مُراد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں چاہتی۔ اُسے دونوں سے برابر کی محبت ہے۔"

کہنے لگا "آج سب پتہ چل جائے گا۔ آخری فیصلہ ہے آج۔"

"خُدا نہ کرے۔ آخر کیا ارادہ ہے؟"

آج میں اور مُراد دونوں اپنے سانڈوں کو لڑا رہے ہیں۔ ہم نے شرط لگائی ہے کہ اگر میرے سانڈ نے اُس کے سانڈ کو مار دیا تو لیلا میری اور اگر اُس کے سانڈ نے میرے سانڈ کو پچھاڑ دیا تو لیلا اُس کی لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ میرا سانڈ اُس کے سانڈ کو ضرور مار گرائے گا۔"

خبر آئی کہ مُراد آگیا ہے۔ رستم کو رخصت کیا اور مراد کو اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ آیا لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے رستم ہی ذرا صورت اور لباس بدل کر واپس آگیا ہو۔ ہاں سچ مچ مُراد اور رستم میں کوئی فرق ہی نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ اُس سے دو مہینہ قبل پیدا ہوا ہو۔ دونوں کی مائیں سگی بہنیں تھیں اور دونوں کے باپ سگے بھائی۔ وہ دونوں اتنے ہم شکل اور اِتنے اچھے تھے کہ ہزار میں نے چاہا کہ لیلا کی نگاہ سے اُن میں کوئی فرق دیکھوں اور ایک کو منتخب کر لوں لیکن نہ کر سکا۔

مُراد کو بھی یہی اُمید تھی کہ اس کا سانڈ اس کے رقیب کے سانڈ کو مار لے گا اور اِس طرح وہ اپنی مراد کو پہنچ سکے گا۔ میں نے جو اپنے دوست سے کہا تھا کہ سانڈوں کی لڑائی نہیں دیکھوں گا اب اصرار کر رہا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ لڑائی شروع کرائی جائے۔

میں جانتا تھا چونکہ سانڈوں کو معلوم ہے کہ

اُنہیں عشق و محبت کی راہ میں جانبازی کرنی ہے اُنہیں کوئی خوف و خطرہ نہ ہوگا۔

دو بجے کے بعد خبر آئی کہ مقابلہ کے لئے میدان درست کر لیا گیا ہے۔ چودھری کے مکان کے قریب ہی کوئی ستر اسّی گز زمین کا ایک ہموار قطعہ تھا۔ ایک سمت دریا بہہ رہا تھا۔ اور دوسری طرف ایک چھوٹا سا سبز پوش ٹیلا تھا۔ میدان کی لمبائی جہاں تک زمین ڈھلوان ہو جاتی تھی کوئی سَو گز کے قریب ہوگی۔ گاؤں والے ٹیلے کے اوپر اور میدان کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔

ہم ایک ایسے ٹیلے پر کھڑے تھے جو زمین سے دو گز اونچا تھا۔ کچھ ہی لمحے گذرے تھے کہ شور و غلغلہ بلند ہوا۔ رستم ایک قوی ہیکل سانڈ کے آگے آگے میدان میں وارد ہوا اور گایوں کا ایک گلّہ اُن کے پیچھے پیچھے آیا۔ رستم میدان کے ایک تہائی حصہ تک بڑھ کر کھڑا ہو گیا اور تھوڑی دیر تک سانڈ کے کان اور سر کو تھپکیاں دیتا رہا۔ سانڈ وہیں بیٹھ گیا اور گائیں بھی ایک ایک کر کے زمین پر بیٹھ گئیں۔

گاؤں والے گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے کہ کب مراد کا سانڈ مخالف سمت سے میدان میں آتا ہے۔ بہت دیر ہو گئی لیکن مُراد کا پتہ تک نہ تھا۔ آہستہ آہستہ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ وہ اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے جسے میں نہ سمجھ سکا۔ صرف ایک لفظ "وطن" سمجھ میں آتا تھا جسے بار بار وہ اپنے مخصوص مازندرانی لہجہ میں دہرا رہے تھے۔ چونکہ اُس وقت لفظ وطن کے اِستعمال کا کوئی موقع نہیں تھا اور میرے ہوش و حواس بھی گم تھے اور نگاہیں لیلیٰ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ گردن اُٹھائے ایک حسین مرمریں مجسمہ کی طرح عورتوں کے درمیان کھڑی تھی اور پوری طاقت کے ساتھ اپنی قلبی کیفیات کو چھپا رہی تھی اور چہرے بشرے سے ظاہر نہ ہونے دیتی تھی۔ میں کسی سے نہ پوچھ سکا کہ اس وقت گفتگو کا کیا موضوع ہے اور وطن کے کیا معنے ہیں۔

ناگہاں مُراد کا سر، سینہ اور تمام جسم میدان کے ڈھلوان حصہ کی طرف سے اُبھرا۔ سانڈ اور گایوں کا گلہ اُس کے پیچھے تھا۔ رستم کا سانڈ آہستہ سے اُٹھا اور دہاڑا۔ گائیں بھی سب کی سب کھڑی ہو گئیں۔

مُراد کے سانڈ نے ایک لمک دار آواز میں جواب دیا۔ چند قدم آگے بڑھا اور کھڑا ہو گیا۔ پیروں کو دائیں بائیں جمایا اور سر کو ایک طرف جھکا لیا۔ رستم کے سانڈ نے حملہ کیا اور اپنے حریف تک پہنچ گیا۔ دونوں کے سر ٹکرائے لیکن اس مرتبہ ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوئے۔ زور آزمائی شروع ہو گئی کبھی ایک قدم آگے اور کبھی ایک قدم پیچھے۔ تماشائی، عورت، مرد بچے، سب پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی لیکن لیلیٰ پر کوئی اثر نہ تھا۔ مجسمہ کی طرح کھڑی تھی۔ نہ تو حرکت کرتی تھی اور نہ اُس کے چہرے سے کوئی اضطراب ظاہر ہوتا تھا۔ سانڈ سر ٹکرا رہے تھے اور ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ایک مرتبہ جو ریلا آیا تو رستم کا سانڈ پیچھے دبتا چلا گیا یہاں تک کہ میدان کے سرے تک پہنچ گیا پھر اُس نے ایک زبردست حملہ کیا اور مُراد کے سانڈ کو ڈھلان تک دھکیلتا لے گیا۔ میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ کس طرح مُراد کا سانڈ زمین پر منہ کے بل گرا اور پھر چِت ہو گیا اور اُس کے پیٹ سے خون کا ایک فوارہ نکلا۔ تماشائیوں میں ایک ہُلڑ مچ گیا۔ شور و غوغا، چیخ پکار اور پھر وہی وطن وطن کی آوازیں آنے لگیں۔

مُراد آہستہ آہستہ میدان میں آیا۔ ماں کی طرف پشت اور لیلیٰ کی طرف منہ۔ بلند آواز میں دیر تک کچھ بولتا رہا۔ اور چند مرتبہ وطن کے لفظ کو بھی دہرایا۔ پھر آہستہ سے لوٹا اور چلا گیا۔

ایک عورت اور ایک مرد جو اس کے ماں باپ تھے اُس کی طرف دوڑے اور اُس سے لپٹ گئے۔ اُس نے دونوں کو جھٹک دیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ تماشائیوں میں پھر ایک شور بپا وہی جملے اور باتیں جن میں ہر مرتبہ وطن وطن کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سب کے سب جانا چاہتے ہیں تاکہ مُراد کو واپس لائیں لیکن اُنہیں اِس کام میں کوئی کامیابی نظر نہیں آتی تھی۔ مُراد نے مصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ گاؤں، گھر اور ماں باپ کو چھوڑ کر مازندران سے کہیں دُور چلا جائے۔

ایکا ایکی۔ پیارے مراد۔ پیارے مراد کی آوازیں فضا میں تڑپیں۔ رُندھے ہوئے گلے اور رونے کی ملی جلی آواز کے ساتھ کوئی پکار رہا تھا "پیارے مراد۔ پیارے مراد" لیلیٰ دوڑی اور مُراد کے گلے میں اپنے بازو حمائل کر کے اُس سے لپٹ گئی۔ اس کے جسم کے ارتعاش سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رو رہی ہے اور تڑپ رہی ہے۔ چند لمحے اسی طرح گزرے اور پھر لیلیٰ اور مُراد واپس ہوئے۔ اور بالکل ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ مُراد نے قبیلہ کے سردار سے کچھ کہا اور سردار نے بھی اُس کا جواب دیا اور پھر ہمیں سمجھانے کے لئے فارسی میں کہنے لگا۔

"تو حق پر ہے۔ تیرے ساتھ دھوکا ہوا ہے لیکن اِس کے بدلے میں خدا نے تجھے تیری لیلیٰ سے مِلا دیا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ تیری ہو گئی ہے۔ لیلیٰ ایسے سو سانڈوں سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہے"

چاروں طرف سے خوشی کے نعرے بلند ہونے لگے۔

میں نے کہا "سردار۔ خدا کے لئے جلدی کر۔ ساری داستان سُنا۔ آخر کیا ہوا۔ ہم بھی تو سُنیں"۔

سردار نے کہا "رستم نے دانستہ یا نادانستہ مُراد کے ساتھ دھوکہ کیا۔ اُصول یہ ہے کہ لڑنے والے سانڈوں کو اپنی گایوں سمیت ایک ساتھ دونوں طرف سے میدان میں آنا چاہئیے۔ لیکن رستم کا سانڈ آدھا گھنٹہ قبل میدان میں آ گیا تھا اور اور اِس طرح اُس نے زمین پر "وطن" کر لیا تھا۔ سانڈ جہاں بیٹھ جاتا ہے وہاں وطن کر لیتا ہے۔ لڑائی کے وقت وطن کی حفاظت کے لئے اُس میں دس گُنا طاقت آ جاتی ہے اور پھر کسی سانڈ کی طاقت نہیں کہ اُسے شکست دے سکے۔ تماشائیوں کی چیخ و پکار اِسی لئے تھی اور چونکہ مُراد کے ساتھ فریب کیا گیا تھا وہ مازندراں کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جانا چاہتا تھا۔ اگر رستم کا سانڈ وطن نہ کرتا تو مُراد کا سانڈ پہلے ہی حملے میں اس کا پیٹ پھاڑ چکا ہوتا۔ رستم نے بے ایمانی کی۔ خدا نے مُراد اور لیلیٰ کے دلوں کو مِلا دیا"۔

میرے اصرار پر اُسی رات جشنِ عروسی برپا کیا گیا۔ صبح تک رقص و سرود کی محفل جمی رہی اور سب خوشیاں مناتے رہے اور میں بھی سرور و شادمانی سے سرشار ہو رہا تھا اِس عیش و کامرانی کی حالت میں، مَیں نے سُنا اور دیکھا کہ دُنیا کی ساری مخلوق، چاند، ستارے، فرشتے اور دُنیا کا ذرّہ ذرّہ وطن کی محبت میں تالیاں بجا بجا کر محوِ رقص ہے۔ تاریک زندگی جگمگا اُٹھی تھی۔

میرے سارے شبہات دُور ہو چکے ہیں۔ اب مَیں سمجھ چکا ہوں کہ مجھے اپنے وطن سے اِتنی محبت کیوں ہے اب مَیں جان گیا ہوں کہ مادرِ کائنات نے اِس محبت کو اپنے دُودھ میں گھول دیا ہے۔ اگرچہ میں پڑھ چکا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حبِّ وطن وہی جذبہ اور علاقہ ہے جو کسی کو اپنے آشیانہ یا مسکن سے ہوتا ہے جو ساری دُنیا پر چھایا ہُوا ہے اور کوچہ، محلّہ، شہر اور ملک کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اب میری سمجھ میں خوب اچھی طرح آ چکا ہے کہ افلاطون نے کیوں کہا تھا کہ: "زندگی کا سب سے مضبوط اور محکم ترین جذبہ، وطن کی محبت ہے" یا آج کل دُنیا والے اپنے اپنے وطن پر کیوں جان دیتے ہیں۔

خودکشی

چند روز قبل میرا ایک دوست میرے ہاں آیا۔
اُس کا اُترا ہُوا چہرہ اس کی پریشان حالی کی غمازی کر رہا تھا۔ نگاہیں کھوئی کھوئی تھیں۔ بھویں سکڑی ہوئی اور رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ وہ نچلا ہونٹ بُری طرح کاٹ رہا تھا۔ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی مسلسل گھبراہٹ اور بیقراری سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغی توازن کو زبردست دھچکا لگا ہے۔
میں نے مزید کسی تاخیر کے جلدی سے پُوچھا "سناؤ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ فلکِ کج رفتار نے پھر کیا گل کھلایا ہے اور تیرے سر پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔ کچھ مجھے بھی معلوم ہو"
وہ یکدم خیالات سے چونکا اور پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"میں آپ سے یہ پُوچھنے آیا ہُوں کہ خودکشی کے لئے سب سے آسان طریقہ کون سا ہے؟"
میں نے پریشان ہو کر کہا:
"تم نے یہ کیسے جانا ہے کہ میں اِس معاملے میں تمہیں مفید رائے دے سکوں گا۔ کیا تم مجھے اِس فن میں ماہر اور تجربہ کار خیال کرتے ہو۔"
اُس نے ایک لمحہ کے لئے لبوں کو سکیڑا۔ پھر بے پروائی سے طنزیہ لہجہ میں بولا:
"میرا خیال تھا کہ تمہارے دِل میں میرے لئے کوئی قدر و قیمت ہو گی لیکن افسوس تم بھی مجھے بے وقوف و احمق ہی سمجھتے ہو۔ اپنا دردِ دل بیان کروں تو کس سے کروں۔ آج دُنیا میں ایسا دوست ملنا مشکل ہے۔ جو اپنے دوست کے درد کو اپنا درد سمجھے اور اس کے جذبات و احساسات کی صحیح قدر کرے۔"
یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آواز گلے میں اٹک گئی۔ میں اُس کی یہ حالت دیکھ کر بہت متاثر ہُوا اور اپنے آپ کو کوستے ہوئے اُس سے معذرت انگیز لہجے میں بولا:
"تم نے غلط سمجھا ہے۔ میں تمہیں اپنا عزیز ترین دوست سمجھتا ہوں۔ تمہاری عقل و متانت کا معتقد ہوں لیکن تمہارا سوال کچھ اِس قسم کا ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا میں نے خود کبھی خودکشی کا تجربہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی جانتا ہوں کہ اس کا آسان طریقہ کون سا ہے۔ افسوس جو لوگ خودکشی کر لیتے ہیں وہ بھی لوٹ کر نہیں آ سکتے کہ ہمیں اِس بارے میں مفید مشورہ دے سکیں۔ البتہ سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جس سے انسان

جلدی ہلاک ہو جائے اس کے لئے شاید گولی چلانے والا طریقہ آسان ہو بشرطیکہ وہ دماغ یا دل میں لگے۔ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جس نے خودکشی کے ارادہ سے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر چلایا تھا جس سے وہ ہلاک تو نہ ہو سکا لیکن اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور وہ بقیہ عمر کے لئے بہرہ ہو گیا۔ میرے خیال میں اسے کچھ تو فائدہ پہنچا یعنی دنیا میں مزید بک بک اور لغویات سننے سے اسے نجات مل گئی مگر اس نے دوبارہ خودکشی کرنے کی کوشش نہیں کی جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس تجربہ کا اثر اس پر کچھ نہیں پڑا۔ ایسے موقع پر انسان کا ہاتھ کانپ جاتا ہے۔ اگر وہ اس مشکل پر قابو پا سکے تو پھر آسانی سے خودکشی کر سکتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران میں نے دیکھا کہ میرا دوست گہری دلچسپی لے رہا ہے۔ چنانچہ میں موضوع کی طرف پلٹا۔

"میرے پاس پستول ہے۔ اگر تمہیں چاہیے تو یہ خدمت سر انجام دے سکتا ہوں۔"

اس نے جواب دیا۔

"بہت مشکور ہوں گا"

میں اٹھا اور اپنے سونے کے کمرے سے پستول نکال لایا اور اس کے ہاتھ میں تھما کر چلانے کا طریقہ اسے سمجھایا حقیقتاً اس موقع پر میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں نے کہا:

"تمہارے سوال کا جواب میں نے دے دیا ہے اگر تم میری دوستی کی کچھ قدر و قیمت جانتے ہو تو مجھ پر بھروسہ کرو اور اب وہ مصیبت و مشکل بتاؤ جس کی وجہ سے تم نے خودکشی کا ارادہ کیا ہے۔"

کہنے لگا۔

"اس ارادہ کا پیش خیمہ کوئی فوری واقعہ نہیں ہے بات یہ ہے کہ دنیا سے سیر ہو گیا ہوں۔ بار بار کے آلام نے تھکا دیا ہے۔ ایسی صورت میں زندگی گزارنے کی کوئی سبیل نہیں پاتا۔ آخر ایک دن تو مرجانا ہی ہے کیوں نہ پہلے ہی زندگی ختم کر لوں اور دنیا کے دکھوں سے دائمی نجات پا جاؤں۔" یہ کہتے کہتے کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے کہا:

"تم غلطی کر رہے ہو اور جو کچھ تم نے کہا ہے میں اسے صحیح نہیں سمجھتا بلکہ تمہارا یہ خیال وقتی اور عارضی ہے۔ اس حالت میں تم اعتدال سے دور جا رہے ہو اور حقائق کو سمجھنے میں غلطی کھا رہے ہو۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے مصائب کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔"

یہ سن کر میرا دوست کرسی پر بیٹھا تیزی سے پہلو بدلنے لگا اور کہنے لگا۔

"اس سے بڑھ کر اور بات کیا ہوگی کہ کچھ لوگ بلاوجہ مجھ سے حسد کرتے ہیں اور میری ترقی میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں میں نے کسی سے برائی نہیں کی اور نہ ہی کسی سے حسد کیا ہے۔ پھر یہ لوگ کیوں میرے در پے ہیں۔ اور کیوں میری زندگی کو حرام کر رکھا ہے۔ میں ان جیسا تو ہوں نہیں کہ ان کی طرف سے بغض و انتقام کا جذبہ دل میں رکھوں۔ دوست اور ساتھی ہیں تو مسکرا کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ واقعی انسان دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار ہے۔ کاش میں اکیلا ہی ہوتا لیکن دوسری طرف یہ لوگ ہیں کہ زنبور کی مانند شیرینی بھی چوس لیتے ہیں اور ڈنک مارنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ہم کولہو کے بیل کی مانند صبح و شام چلتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچتے۔ اگر کوئی ذریعہ ہوتا تو دنیا سے صحیح معنوں میں لطف اٹھاتے لیکن افسوس کہ اس دنیا میں لطف بھی پیسوں ہی سے خریدنا پڑتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ تہی دست ہوں قسمت

کا رونا نہ روؤں تو اور کیا کروں۔"

ہم اُٹھے اور ایک دوسرے سے باہم گلے ملے اور ہمدردی کے آنسو ہماری آنکھوں سے بہہ نکلے۔

مَیں نے کہا

"مَیں نہیں چاہتا کہ تمہارے ارادے میں رُکاوٹ ڈالوں لیکن چونکہ مرنے کا موقع ہر وقت میسّر آسکتا ہے اور ہم مدّتِ دراز تک یونہی مُردہ پڑے رہیں گے اِس لئے مَیں چاہتا ہُوں کہ تم کچھ دن کے لئے اپنے ارادے کو ترک کر دو اور میری ایک درخواست قبول کرو۔ وہ یہ کہ اپنی زندگی دو دن کے لئے میرے حوالے کر دو اور جس طرح مَیں کہوں اسی طرح اِسے بسر کرو۔"

وہ کچھ دیر کے لئے جھجکا، پھر رُک رُک کر کہنے لگا "اچھا۔ تمہاری خاطر دو دن یہ تکلیف بھی برداشت کر لیتا ہوں۔"

مَیں نے کہا

"اِن دو دنوں میں جو تکلیف بھی تمہیں دوں۔ اُسے قبول کرو۔"

کہنے لگا

"مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ جانتا ہُوں کہ کس ہستی کے واسطے یہ تکلیف برداشت کر رہا ہُوں۔"

مَیں نے کہا

"یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ اِس دُنیا میں تم نہ رہو اور تمہارے مرنے کے بعد تمہارے دشمن خوشیاں منائیں۔ اِس کے لئے تمہیں یہ کرنا چاہیئے کہ تم اپنے تمام دشمنوں سے ملاقات کرو اور اِس انداز سے کرو کہ جیسے کسی محبوب سے بچھڑ جانے کے بعد اُس سے صلح کی جاتی ہے۔ ظاہری طور پر اُن سے محبت و خلوص سے مِلو اور اپنے الفاظ و گفتگو سے اُنہیں متاثر کرو۔ چونکہ زندگی بسر کرنے کا خیال تم سرے سے رکھتے ہی نہیں لہٰذا ان سے محبت کے سلوک کے نتیجہ کا انتظار بھی نہیں کرنا چاہیئے حتّٰی کہ اگر کوئی تمہاری مہربانی قبول کرنے سے اِنکار بھی کر دے تو تم محسوس نہ کرو اور اس کا شکریہ ادا کر کے چلتے بنو کیونکہ تمہیں کسی کی امداد اور دوستی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اِس پیار اور اچھے اخلاق سے مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے دِل تمہارے مرنے کے بعد دُکھی ہوں اور بجائے خوش ہونے کے اظہارِ افسوس کریں۔"

"پھر تم اپنے رفیقوں اور دوستوں کے ہاں جاؤ اور اُن سے خندہ پیشانی اور لطف و مہربانی سے ملو۔ اُن سے پُوچھو کہ اُنہیں کوئی تکلیف ہو تو تم اُسے دُور کرنے میں اُن کی مدد کر سکتے ہو۔ اِس سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ دوست اپنے گذشتہ رویہ کو یاد کر کے اظہارِ ندامت کریں گے۔"

"ایک کام اور ہے جو قدرے مُشکل ہے لیکن تمہیں پُورا کرنا چاہیئے کیونکہ تمہاری زندگی کی چند گھڑیاں میرے قبضۂ اختیار میں ہیں۔ کل صبح کے وقت، سُورج نکلنے سے پہلے، چھت پر جا کھڑے ہو۔ طلوعِ آفتاب سے ایک ساعت چھت پر رہنا اور اپنے مصائب و تکالیف کو یاد کرنا۔ سُورج طلوع ہونے کا منظر دیکھ کر فضا میں کتنے رنگ بنتے ہیں، پہاڑ اور قدرت کے مختلف نظاروں کو دیکھنا اور خوش الحان پرندوں کے نغمے سُننا۔"

"میرے خیال میں صبح کی سفیدی وہ نُور ہے جو عشق کے پیدا ہونے سے دِل میں چمکتا ہے یہ خالص محبت ہے اور وفا و محبت کے باغ کی ہَوا۔ یہ خالص آنسو ہیں جو ہم دوسروں کی بدبختی پر بہاتے ہیں۔ یہ وہ آہیں ہیں جو ہم غریبوں اور حاجت مندوں کی بے چارگی پر بھرتے ہیں۔ یہ دِل کی پاکیزگی ہے جو ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی تسلی کے لئے وقف ہے۔ یہ آزادی

وہ نکتہ ہے جس میں ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ تم بھی اِن الفاظ کے مطالب پر غور کرو اور دیکھو تم بھی میری طرح احساسات رکھتے ہو اور میری طرح سوچ سکتے ہو۔"

"سورج طلوع ہونے کا نظارہ دیکھ کر اپنے کام پر جاؤ اور روزمرّہ کے کاموں میں مشغول ہو جاؤ لیکن گزشتہ طریقے سے نہیں۔ اپنے کام کو اِس طرح سرانجام دو کہ تمہارے بعد لوگ تمہاری کمی محسوس کریں اور حسرت و افسوس کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر تم نے صبح کا ناشتہ کرنا ہو تو تمہارے ناشتہ میں روٹی، پنیر، دہی اور اخروٹ ہونے چاہئیں یا اپنی پسند کی کوئی اور غذا لیکن شرط یہ کہ اس کی قیمت دو ریال سے بڑھنے نہ پائے۔ گھر والوں کے ساتھ بھی ہنسو، کھیلو اور بہت محبت سے پیش آؤ اور کسی چیز پر اعتراض نہ کرو۔ دو روزہ زندگی دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ تمہارے مرنے کے بعد انہیں حقیقی دکھ ہو۔"

"فارغ وقت گزارنے کے لیے مثنوی مولانا رومؒ یا دیوانِ حافظ پڑھ لیا کرو۔ پرسوں تک اپنی یہ بے کیف زندگی اِس طرح بسر کرو۔ تیسرے روز جو مرضی آئے کرو۔"

میرا دوست مسکرایا اور کہا

"کیا دھوکہ بازی کر رہے ہو۔"

مَیں نے ماتھے پر بَل ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تمہارے نزدیک یہ دھوکہ بازی ہے۔ کیا تم نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا کہ تمہاری زندگی کے آخری ۴۸ گھنٹے میرے اختیار میں ہیں۔ لہٰذا جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کر اور خوب جان لے کہ یہ بحث کا مقام نہیں ہے۔"

اُس نے پستول اُٹھایا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

تیسرے دن میں نے سیاہ لباس پہنا اور اُس کے گھر گیا۔ اُس نے میرا استقبال کیا۔ اُس کا چہرہ ہشاش بشاش اور خوشی سے تمتما رہا تھا۔ مَیں نے کہا

"ماتم کی آخری رسُوم کے لیے آیا ہوں۔"

ہنسا اور کہنے لگا

"مرنے کے لئے ابھی کافی وقت ہے۔ چاہتا ہوں کہ تمہارے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کچھ عرصہ اور زندگی بسر کر لوں۔"

مَیں نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا اور ہماری آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔

آبرُو

ہمسایہ کے گھر سے رونے کی آواز آئی معلوم ہوا کہ ایک بڑھیا کافی عرصہ سے بیمار ہے اور قریب المرگ ہے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا اور ایک پریشان حال لڑکی اندر داخل ہوئی اور روتے ہوئی چلائی "آہ ۔میرا بھائی مر گیا"۔

اچانک اندر آنے پر اُسے اپنی غلطی کا احساس ہُوا اور شرم اور خوف کے مارے اُس کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ ایک اچٹتی سی نگاہ ہم پر ڈالی اور واپس چلی گئی۔

ہم اُس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر گئے اور دیکھا کہ وہ پیارا سا نوجوان ایک کمرے کے کونے میں ایک پھٹی پرانی دری کے ایک ٹکڑے پر پڑا تھا۔ یہی وہ جوان تھا جسے میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ وہ اُترے مرجھائے ، اُڑی اُڑی سی رنگت اور اندر کو دھنسی فکرمند آنکھوں اور شریفانہ انداز سے اپنے سر کو جھکاتا اور سلام کرتا تھا۔

بوڑھی عورت اُس کے پہلو میں مُردہ پڑی تھی اور اُس کا ایک ہاتھ بیٹے کی طرف بڑھا ہُوا تھا۔ تین دُبلی کمزور لڑکیاں جو ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتی تھیں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مصیبت زدہ ماں اور بھائی کے سر پر کھڑی تھیں۔ اِنتہائی پریشانی کے عالم میں ان دونوں کے لئے لہو کے آنسو بہارہی تھیں۔ ہم ڈاکٹر کو بُلا لائے اور ان کے علاج معالجہ میں مصروف ہو گئے۔ بڑھیا تو دم توڑ چکی تھی لیکن جوان لڑکا ہوش میں آگیا۔ ابھی اُن کے عِلاج سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ لڑکیوں میں سے ایک گِری اور بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نہایت تجربہ کار تھا۔ اُس نے کہا " اِس تباہ حال گھر میں موت کا دیو ننگا اور بے دھڑک داخل ہو گیا ہے بجائے اِس کے کہ بیماری کی شکل میں ان کی جان لے وہ خوفناک بُھوک کی شکل میں آیا ہے تاکہ ان کا خاتمہ ہو۔ یہ سب بھوک سے مر رہے ہیں"۔

ہم نے جلدی سے انہیں کھانا مُہیّا کیا اور بیچاری بے ہوش لڑکی کو ہوش میں لائے لیکن اُن کی بہنوں نے جو ابھی تک ہوش میں تھیں کھانا کھانے سے اِنکار کر دیا۔ اُن کی نگاہیں اپنے بھائی کے چہرے پر گڑی تھیں۔ لڑکے نے آنسو بہا کر کہا۔

"کھالو۔ ہماری حالت بہت خراب ہو رہی ہے"

دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ دو سال پہلے اُن کا سربراہ فوت ہو گیا تھا اور بیوہ کو ایک لڑکے اور تین لڑکیوں کے ساتھ بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔ لڑکے نے مجبوراً اسکول چھوڑ دیا۔ اور ملازمت اختیار کر لی لیکن یہ تھوڑی سی آمدنی

اتنے افراد کے لئے ناکافی تھی۔ اکثر راتیں اور کبھی کبھی دن بھی بھوک سے بسر ہوتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اُن کی ماں کا انتقال دوا نہ ملنے کی وجہ سے ہوا اور خود وہ نوجوان بھوک اور بے ہمتی کی وجہ سے بے حد کمزور ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "اِن جوان لڑکیوں کو کسی کام پر کیوں نہیں لگاتے تاکہ اپنی روٹی کا بندوبست کر سکیں"۔

اُس نوجوان نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا "ہم باعزت لوگ ہیں۔ ہمارے لئے عورتوں سے ملازمت کروانے سے مر جانا بہتر ہے"۔

مَیں سوچنے لگا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اِس نوجوان نے عزت اور شرافت کو جو ایک تیز تلوار کی طرح جان کی حفاظت کے لئے استعمال کی جاتی ہے اپنی بیوقوفی سے اسے اپنے سینے میں پیوست کر دیا ہے۔

مَیں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "تم غلط سوچ رہے ہو۔ بے عزتی تو بیکاری میں ہے۔ جس کسی کی تو بے آبرو بنانا چاہے اُسے کام سے باز رکھ اور مفت کی روٹی دے جلد ہی جوانمردی اور شرافت اُس کے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور وہ ذلیل و خوار ہو گا۔ اور سوائے غلامی اور ذِلت کے وہ کسی کام کا نہ رہے گا"۔

اُس نے کہا "میں ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتا لیکن تمہاری مہربانی کی وجہ سے جو تم نے ہم پر کی ہے مَیں تمہاری بات مان لیتا ہوں"۔

چنانچہ ہر ایک لڑکی کام پر لگ گئی۔ چند ہی مہینے گذرے تھے کہ غم اور موت کا دیو اِس ویران اور بدحال گھر سے مایوس ہو کر چلا گیا اور اُس گھر میں رونق اور گہما گہمی نظر آنے لگی۔

ماہرِ چشم

مجھے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرا کے عینک کا نمبر لینا تھا۔ ڈاکٹر سے نمبر لے کر جب میں عینک خریدنے جا رہا تھا تو راستے میں ایک دوست سے ملاقات ہو گئی۔ علیک سلیک کے بعد کہنے لگا کہ کدھر کا ارادہ ہے۔ میں نے یونہی انٹ شنٹ سا جواب دے کر گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ اُس کا یہ سوال معقول نہ تھا مگر مجھے بعد میں اپنی یہ حرکت بُری لگی کہ آخر مَیں نے حقیقت کو کیوں چھپایا۔

وہ تو چلا گیا لیکن میں ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ آخر دل نے یہ کہا کہ کسی پر بھی یہ راز کھُلنے نہ پائے کہ تیری بینائی اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ عینک درکار ہے اور دل کی یہ بات تھی بھی حقیقت پر مبنی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے عاقل فرزانے اور فیلسوف قسم کے لوگ دوسروں کے سامنے پڑھنے کے معاملے میں کچھ اِس قسم کا رویّہ اختیار کر جاتے ہیں جیسے وہ اپنی نظر کی کمزوری کو چھپا رہے ہوں۔

دیر تک اِنہی خیالات میں کھویا رہا۔ آخر اِس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم جو کام کرتے ہیں اُس میں خود نمائی اور خود ستائی کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہی دو چیزیں ہیں جو ہمارے دُکھ اور درد کا باعث بنتی ہیں۔ ہماری فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ہر ممکن اور ناممکن طریقے سے خود کو وہ کچھ ظاہر کریں جو ہم نہیں ہیں اور یوں کسی ایسی چیز کو جو ہماری اہلیت و لیاقت سے بالاتر ہو حاصل کر سکیں۔ ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو حد سے زیادہ دانا۔ خوبصورت۔ صحتمند اور توانا ظاہر کریں اور اِسی باعث ہم نِت نئے مصائب و آلام میں گرفتار رہتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی کِسی بھی شخص کو اِس بات کا اقرار کرتے سُنا ہے کہ وہ درستی کے لائق نہیں ہے یا یہ کہ علم و عرفان کی دولت سے مالا مال ہونے کے باعث وہ دنیوی جاہ و جلال سے بیزار ہے وہ کچھ حاسد بھی ہے اور دوستوں کی کامیابی اور خوشبختی اُسے اچھی نہیں لگتی یا دوستی کے جو صحیح معنی ہیں اُن سے وہ بالکل بے خبر ہے۔

آپ نے کبھی ایسی عورت کو دیکھا ہے جو بناؤ سنگھار کے بغیر یا کم از کم ناز نخرے کے بغیر سامنے آئے یا کِسی ایسے شخص سے ملنے کا اِتفاق ہُوا ہے جس نے بات چیت کے دوران میں کسی نہ کِسی طریقے سے اپنی خوبیاں اور دوسروں کی بُرائیاں نہ گنوائی ہوں۔

اگر ہم اپنے اور دوسروں کے قول و فعل پر ذرا غور

کریں تو ہمارا سر ندامت سے جھک جائیگا اور وہ کوفت دوچند ہو جائیگی جو خودٗ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے پیدا ہوتی ہے یا پھر یہ بات ہے کہ ہم ایک ایسی بازی گاہ میں ہیں جہاں اپنا اور دوسروں کا ہمیشہ مذاق اُڑاتے ہیں۔

اگر انسان خودٗ نمائی اور ظاہر پرستی کا اِس قدر شکار نہ ہوتا تو آج یہ زندگی کس ڈگر پر ہوتی۔ کیا ہم اِس سے اچھی زندگی بسر کر رہے ہوتے یا زیادہ تکلیف یا دُکھ کا شکار ہوتے۔ اِن سوالوں کا جواب نہ تو میرے پاس ہے اور نہ اِن سے میرا کوئی واسطہ ہے۔ ہاں تو مَیں کہنے لگا تھا کہ جب میں اِنتظار گاہ میں ڈاکٹر کا اِنتظار کر رہا تھا تو میرے سامنے ایک بُوڑھا آدمی بھی بیٹھا تھا۔ اُس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا اور سر کو مسلسل جھکائے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی خیالات کی رَو میں بہتے ہوئے وہ سر اور ہاتھوں کو حرکت میں لاتا اور مَیں محض اِس لئے کہ اپنی مختلف گتھیوں کو سُلجھاؤں یا اپنی مشکلات میں کسی نئی اُلجھن کا اِضافہ کروں اس کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہے جس وقت وہ اپنا ہاتھ اُوپر کو اُٹھاتا ہے تو وہ کس کے ساتھ لڑ رہا ہے اور کون سا وار خالی جا رہا ہے جس وقت وہ اپنی انگلیوں کو اس ڈھب سے ہلاتا ہے جیسے کوئی ہاتھ میں سیب اُچھال رہا ہو تو اُس وقت وہ کونسا ایسا نقشہ کھینچتا ہے جس سے دنیا کی بے انتہا خوشیوں کو وہ ایک دم حاصل کرلے۔ اِدھر تو میں اس بُوڑھے کی حرکات میں محو تھا اور اِدھر اتفاق سے دوسری جانب ایک سات آٹھ سال کا بچہ ایک بینچ پر اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ہم سب ایک دوسرے میں کِس قدر کھوئے ہوئے ہیں۔ آدمیوں کو دیکھنا بھی گویا ہماری زندگی کی بہت بڑی ضرورت اور تفریح ہے آپ تنگ بازاروں میں لوگوں کو خوب دھکم پیل سے گزرتے دیکھتے ہیں۔ اگر وہ اِس تکلیف کو جو اُنہیں گزرتے وقت اٹھانا پڑتی ہے کھلی فضا میں سَیر کرنے یا تنہائیوں میں وقت گزارنے پر ترجیح دیتے ہیں تو محض اِس لئے کہ وہ ایک دوسرے کو بالکل قریب سے دیکھیں اور اپنے وجودٗ کو دوسروں میں گُم کر دیں۔

اسی دوران میں ایک اور بوُڑھے کے آنے سے میرا سلسلۂ خیال ٹوٹ گیا۔ اس بیچارے کو صاف طور پر دِکھائی نہ دیتا تھا۔ کبھی تو وہ در و دیوار اور کبھی کندھوں پر ہاتھ ملتا۔ پہلے بوُڑھے شخص نے از راہِ ہمدردی جو ایک مصیبت زدہ کو دوسرے سے ہوتی ہے۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بِٹھا لیا۔ اور دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔

اُن کی پہلی چند باتیں میرے پلے نہ پڑیں لیکن پھر فوراً ہی اُن کی صدائے نالہ و فریاد بلند ہوئی۔ کیا آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ وہی میرے دوست اور لنگوٹیے حسن جان ہیں دوسرے نے آہ بھری اور کہا کہ یہ دُنیا بھی کیا تماشا گاہ ہے میں تمہیں اِس وقت کہاں اور کِس رنگ میں دیکھ رہا ہوں۔

بینائی کمزور ہونے کے باعث بے چارے اپنے تعجب کا اظہار جو ایک عام آدمی مختلف حرکات و سکنات سے کرتا ہے محض آہ و فریاد ہی سے کر سکے۔ اُن کی باتوں سے مَیں ایک لحظہ بھی غافل نہ ہوُا۔ پہلے بوُڑھے نے کہا "واہ بھئی۔ تم کیوں ہم سے ایک دَم دُور ہو گئے۔ تمہارا وہ تمام قہر و ناز اور وہ دُشنام طرازی کِس لئے تھی۔ خیر چھوڑو۔ میں تمہیں سچ سچ سُنائے دیتا ہوں۔ یہی کوئی پینتیس برس گزرے ہوں گے۔ آہ! جو کچھ تھا سب گزر گیا۔ میرا مقصد اب تمہیں قصوروار ٹھہرانا نہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے پینتیس برس پیشتر ایک دِن صبح کے وقت ہم دونوں بیٹھے خوش گپیوں میں معروف تھے اور اپنی تنخواہوں میں اِضافہ نہ ہونے کا گِلہ شکوہ کر رہے

تھے کہ اتنے میں وزیر کا خادم آیا اور مجھے بُلا کر لے گیا جس وقت مَیں واپس آیا اور میں نے تمہیں بتایا کہ مجھے خراسان میں مامور کیا گیا ہے تو تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس وقت تو خیر میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی لیکن بعد میں جب میں نے غور کیا تو تمہارا زرد اور سُرخ رنگ میرے ذہن میں گھوم گیا مَیں بھی تو بے قصور نہ تھا کیونکہ میں نے دوستانہ اطمینان کے ساتھ تمہیں یہ خبر بڑے ہی پُر مسرت لہجے میں سُنائی تھی اور پھر اُس دن سے تم میرے دشمن ہو گئے۔ ہر چند میں نے تمہیں بیسیوں خط لکھے لیکن تم نے کسی ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ پھر مَیں نے سُنا کہ تم مجھے بُرا بھلا کہتے ہو اور میری ترقی کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہو۔ ادھر میں دن رات اِس سوچ میں رہتا کہ آخر تمہاری اِس دشمنی کا باعث کیا ہے۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فطرتی طور پر تم کس قدر حاسد ہو اور کس طرح بلا وجہ دُکھ اٹھاتے ہو۔ میرا دِل تمہارے لئے بے حد پریشان تھا کیا کرتا۔ میرا ہاتھ بھی تو تم تک نہ پہنچ سکتا تھا جو تمہارا علاج ہی کراتا۔ کاش! میں اِس زرق برق مگر کھوکھلے منصب پر فائز نہ ہوتا۔ کون کون سی افتاد تھی جو مجھ پر نہ پڑی ہیں تو ختم ہو چکا ہوں۔"

دوسرے بوڑھے نے بے اختیار اور کچھ متعجب ہو کر ایک پُر اسرار ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے تو سُنا تھا کہ تم نے اس سفر سے سینکڑوں فائدے اٹھائے تھے اور خوب مال کمایا اور محض لوگوں کی نکتہ چینی اور گرفت سے بچنے کے لئے تجارت شروع کر دی اور یوں اپنے سرمائے میں دن رات اضافہ کیا اور ہاں یہ دولت ہی تو ہے جو سب کام سنوارتی ہے۔ میں بدنصیب ابھی تک محدود آمدنی میں گزر بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ سب نصیب کی بات ہے باقی لیاقت اور قابلیّت تو بے معنی باتیں ہیں۔ اگر اُس دن تمہارے بجائے وزیر نے مجھے بلایا ہوتا اور اس منصب پر بھیجا ہوتا تو ـــ خیر کیا عرض کروں۔ یہ سب محض ایک قدم آگے بڑھنے کی باتیں ہیں۔

پہلے بوڑھے نے ایک طویل ہنسی ہنسی اور کہا "خدا کی قسم! پینتیس سال کے بعد بھی تم اُسی طرح ہو۔ ذرہ بھر بھی تم میں تبدیلی نہیں آئی۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ تم نے اتنی مدت تک میری اِس ترقی سے کس قدر دُکھ اُٹھایا ہو گا۔ اب میری داستان بھی سنو کہ اُس سفر میں مجھ پر کیا گذری۔ میری بیوی فوت ہو گئی۔ بٹیا چیچک کے سبب خدا کو پیارا ہو گیا۔ مَیں تو پاگل سا ہو گیا اور اِسی جنون میں مَیں نے اِستعفیٰ دے دیا۔ اِس کے بعد مَیں نے اپنا تہران والا مکان بیچ دیا۔ کھانے پینے کے بعد جو تھوڑی بہت پونجی بچی اُس سے میں نے ایک معمولی سا کاروبار شروع کیا لیکن خدا جانتا ہے کہ مَیں نے اپنی ناتجربہ کاری کے باعث کیا کیا رنج اُٹھائے۔ تین مرتبہ تو دیوالیہ ہوتے ہوتے بچا۔ اِس وقت جو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں تو خدا شاہد ہے کہ میری مالی حالت بہت خراب ہے۔"

دوسرا پکار اٹھا۔ "کیا درست کہتے ہو۔ تم اب بالکل مُفلس ہو؟" پہلا مسکرایا اور کہنے لگا "حسن جان یقین کرو اور خوش ہو کہ تم سے زیادہ بُری حالت میں ہوں۔ تم جانتے ہو میں تمہیں کتنا عزیز جانتا تھا اور اب بھی اُسی طرح عزیز جانتا ہوں۔ دوستی کو فراموش نہیں کیا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو اور آؤ کہ ہم زمانے کے خلاف جس نے یہ تمام بے مہری اور جدائی ہم دونوں کے درمیان ڈالی اپنی اِس بقایا چند روزہ زندگی کو پیار اور محبت سے گذاریں۔ اگرچہ اب ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سے نہیں دیکھ سکتے لیکن آؤ ہم ایک دوسرے کی آواز ہی سے مسرت و شادمانی حاصل کریں۔

مگر شرط یہ ہے کہ اب مجھ سے کسی قسم کا حسد نہ رکھنا تاکہ تم دوستی کی لذت سے محظوظ ہو سکو۔"

دوسرے بوڑھے نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے غلط سمجھا۔ بہرحال آج سے میں تمہاری دوستی اور غلامی میں رہوں گا۔ یہ منصب اور عہدہ تو معمولی باتیں ہیں۔ اگر ہم میں سے ایک کو بہشت میں بلایا گیا تو تم دیکھو گے کہ میں تمہیں زبردستی وہاں بھیجوں گا۔"

ان کا یہ گلہ شکوہ، پشیمانی اور کمالِ شوق سے عہدِ شکستہ کو پھر سے باندھنا۔ اِن تمام باتوں سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری آواز بھرا سی گئی۔ میں نے دِل میں خیال کیا کہ میں تو یہاں آیا تھا اپنے چہرے کی آنکھ کو روشن کرنے کے لئے لیکن میرے دِل کی آنکھ روشن ہو گئی۔ کِس قدر عبرت آمیز اور کسی حکیمانہ نصیحت آج مجھے حاصل ہوئی۔ کاش! اِن کی باتیں ہر کسی نے سُنی ہوتیں۔ تو یہ دنیا ایک گلزار بن جاتی۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب جہاں کہیں بھی کسی رشتہ دوستی کو ٹوٹا ہوا پاؤں گا اسے جوڑ دوں گا۔ اور جہاں کہیں اِس میں کچھ کمزوری واقع ہوئی ہو گی وہاں اُس میں مضبوطی پیدا کروں گا۔

اِسی دوران میں ڈاکٹر کا نوکر آیا اور کہا۔ "آیئے" پہلا بوڑھا شخص اُٹھا اور چل پڑا۔ اِس پر حسن جان نے نوکر کی طرف مُنہ کرتے ہوئے زور سے کہا۔ "مجھے پہلے جانے دو۔ میری آنکھیں تو اندھی ہوا چاہتی ہیں۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ پہلے آنے والا شخص پہلے ہی اندر جائے۔ یہ کیا حماقت ہے"

پہلا بوڑھا شخص مُڑا اور بڑی پُر درد اور نااُمید آواز میں کہنے لگا "دیکھا حَسن۔ تم پھر عہد نہ نبھا سکے۔"

مجھے خیال آیا کہ ایک بد سرشت کے عہد و پیمان پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"

مجلسِ عیادت

محض اِس خیال کے پیشِ نظر کہ سیاسی قائدین میں سے کیوں پیچھے رہوں، بادلِ ناخواستہ اپنے "محبوب" وزیر کی عیادت کو چلا گیا۔ بدقسمتی سے میرے دیگر رفقاء جو ایسے امورِ خیر میں تذبذب کو راہ نہیں دیتے، میرے پہنچنے سے پہلے اِس وجودِ عزیز کو نگینۂ سعادت کی طرح اپنے حلقے میں گھیرے ہوئے بیٹھے تھے۔ مجھے بمشکل اِس گوہرِ دلفروز کی شعاعوں کے دائرے سے باہر ایک گوشے میں جگہ میسر آئی میرے رفقاء نے میری طرف کچھ یونہی سا التفات کیا اور اپنے "منصبی فرائض" کی انجام دہی میں لگ گئے۔

میں نے چاہا کہ حضور والا کے مزاجِ عالی کے بارے میں کچھ دریافت کروں، وہ عبارتیں زبان پر لاؤں جنہیں راستے بھر بناتا اور سنوارتا رہا تھا لیکن موقع نہ مِلا۔ دو تین مرتبہ سر اور گردن اُونچی کر کے بولنا چاہا لیکن دَم سینے میں گھُٹ کر رہ گیا۔ پہلی بار آواز حلق میں اٹک گئی دوسری مرتبہ شرما گیا اور تیسری مرتبہ ایک اور صاحب اُسی وقت بول پڑے۔ یوں میری آواز دب گئی۔ کچھ دیر بعد مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ شرف یابی کے لیے کیوں آیا تھا۔ اِظہارِ خلوص کا موقع ہاتھ سے گنوا کر یوں محسوس ہُوا گویا بھری محفل میں تنہا رہ گیا ہوں۔ ایسے لگا جیسے خود تاریکی میں ہوں اور مجمع روشنی میں۔ اِمکان بھر اپنی جگہ سمٹ گیا تاکہ مجمع کی نظروں سے چھپ جاؤں۔ ایک ایسے بچے کی مانند میرا دِل بلیوں اُچھل رہا تھا جسے تماشا گھر میں تھوڑی سی جگہ بیٹھنے کو مِل جائے۔ اَب میں ہمہ تن محوِ تماشا تھا۔

مَیں نے دیکھا کہ لوگوں کی پتلیاں نقاش کے پردے پر کشیدہ تصویروں کی مانند ایک ہی جانب ایک نقطے پر مرکوز ہیں۔ حاضرین میں سے ایک صاحب جو خاموشی کے سوا ہر طرح کے شرح و بیان کو عیب تصور نہیں کرتے، فرمانے لگے "قبلہ! آپ کے سرِ مبارک کی قسم۔ پرسوں جب آپ کے وزارت خانے میں تشریف آوری کا متوقع وقت گزر چکا تو اِضطراب اور پریشانی شدت سے بڑھنے لگے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہزاروں چھوٹی اور بڑی چیونٹیاں میرے جسم میں حرکت کر رہی ہیں۔ عالی جناب سے میری روحانی وابستگی کا عالم ملاحظہ فرمایئے کہ فوراً میرا ذہن اس طرف گیا کہ خدانخواستہ ہزار بار خدانخواستہ کہ عالی جناب کِسی علالت سے دوچار ہیں۔ دوستوں سے اِس بات کا ذکر کیا اور یہ سب اس کے گواہ ہیں۔ یہ تشویش میری رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ جونہی مجھے یہ اِطلاع ملی کہ میرا منحوس خیال صحت و صداقت پر مبنی ہے۔ میرا بازو اور جسم

کا جوڑ جوڑ متورّم ہوگیا۔ ناہنجار گٹھیا کا مرض پہلے ہی سے میرے گلے کا ہار ہے۔ پرسوں رات اور کل رات طلوعِ صبح تک ایک پل نہ سو سکا۔ اِس کے باوجود جوں توں کر کے خودؔ کو وزارت خانے پہنچایا اور کوئی دس بجے تک کام میں مشغول رہا۔ آپ جانتے ہیں چاہے ایک ہی دن کی سہی مگر کام سے غفلت تو نہیں کی جا سکتی۔ میری جان پر بھی بَن آئی۔ حضور! صاحبِ درد ہی نالۂ ہمدرد کو سمجھ سکتا ہے۔ احقر خوب جانتا ہے کہ عالی جناب پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ الحمدللہ کہ دیگر حضرات خوش و خرم ہیں۔"

وزیر صاحب نے کرب کے ساتھ چشم و اَبرو گھمائے اور ایک پاؤں کو بدقت حرکت دی اور دھیمے لہجے میں رُک رُک کر کہا "درست فرمایا آپ نے .... روحانی وابستگی سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا اور..." ساتھیوں میں سے ایک صاحب جواباً کچھ کہنا چاہتے تھے کہ حاضرین میں سے ایک اور صاحب نے تیزی سے ان کے مُنہ سے بات چھین لی اور زوردار آواز میں کہنے لگے "جی! کئی سال سے میں خودؔ بھی اس مرض میں مبتلا ہوں۔ گھر کا سارا اثاثہ ڈاکٹروں کی نذر ہوگیا۔ جان سخت عذاب میں تھی۔ آخر کار ایک بُڑھیا نے دو پیسے کی دوائی میں علاج کر دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، بیماری قریب سے نہ پھٹکی۔" پھر اُنہوں نے ایک لحظہ اِس انتظار میں گزارا کہ شاید وزیر صاحب اِس دوائی کی خواہش اور فرمائش کریں گے مگر وزیر صاحب اپنی جگہ سوچ رہے تھے کہ معجون خودؔ ہی پیش کی جائیگی۔ یہ صاحب وزیر موصوف کی زبان سے خواہش کا اِظہار چاہتے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ حاضرینِ مجلس میں سے ایک اور صاحب جو اِس گفتگو سے سخت مشتعل ہو چکے تھے اور اپنی جگہ مسلسل پیچ و تاب کھا رہے تھے، اِس انتظار کے لمحے کو غنیمت سمجھ کر بول پڑے "چھوڑیئے صاحب، یہ سب لایعنی باتیں ہیں۔ قبلہ! آپ کسی طبیب حاذق سے رجوع فرمائیں۔ افلاطون الحکماءؒ سے اِس حقیر کے نہایت گہرے مراسم ہیں۔ آج ہی اُن کو حضور مبارک میں پیش کرتا ہوں۔ یقین فرمایئے کہ تین دن کے علاج میں حضرت نہ صرف یہ کہ چلنے پھرنے لگیں گے بلکہ ساتھ ساتھ وزارت خانے کے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔"

معجون والے صاحب نے اِس پر ایک جھوٹا قہقہہ لگایا اور کہا "کیا آپ بندے پر دروغ گوئی کی تہمت نہیں لگا رہے ہیں؟ محترم وہ معجون میں نے خودؔ کھائی ہے اور شفایاب ہوا ہوں حالانکہ چند سال پہلے شہر کے سارے طبیبوں نے مجھے اپنی آمدنی کا مستقل ذریعہ اور دودھ دینے والی گائے سمجھ رکھا تھا۔ اُنہی میں آپ کے یہ افلاطون الحکماءؒ بھی ہیں۔ خیر اِس دنیا میں تو حساب کتاب کیا ہوگا۔ اِن شاء اللہ اُس دنیا میں اس کا پورا بدلہ چکا لوں گا اور میں آپ کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر زندہ ثبوت کیا چاہیئے۔ آپ کی محسوسات کے منکر تو خیر آپ تھے ہی۔ اب معلوم ہوا کہ غیر محسوس پر بھی آپ کا اعتقاد نہیں ہے۔ کیا عرض کیا جائے؟"

مخاطب نے تلملا کر کہا "اسی بڑھیا کی دوا سے میرے والد صاحب ہلاک ہوئے۔ اب جو آپ کا دل چاہے فرمائیں۔ مجھے بے اعتقاد اور بے ایمان ٹھہرا کر آپ سچے اور دیانتدار بنتے ہیں تو بنا کریں۔ میں اِس میں کیا کر سکتا ہوں۔"

پھر کیا تھا ایک زوردار ہنگامہ شروع ہوگیا۔ کچھ لوگ ہم آواز ہو کر کہہ رہے تھے کہ جوڑوں کے درد کا علاج قدیم نسخوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ دوسرا گروہ اِس بات پر مصر تھا کہ جدید تحقیقات سے اِستفادہ کیا جائے۔ دیر تک یہ موضوع زیرِ بحث رہا۔ اس اثنا میں ایک اور صاحب جن کا وظیفۂ حیات ہمیشہ آہیں بھرنا اور

بھرائی آواز میں گفتگو کرتا تھا۔ تڑپ کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُٹھے اور کہنے لگے "بارگاہِ ایزدی اور آستانِ آئمہ اطہار میں میری تو یہ التجا ہے کہ خداوند خود شفا عطا فرمائے اور کسی کو حکیموں اور دواؤں کا محتاج نہ کرے۔ ہر درد کی دوا خدا کے پاس ہے ورنہ چار مہینے ہونے کو آئے بندہ خود بیماری کے ہاتھوں گرفتار ہے۔ جو مجھ پر گزر رہی ہے وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ ہی رحم فرمائے ورنہ اِن طبیبوں اور دواخانوں کے چکّر نے تو میری جان نکال لی ہے۔"

وزیر صاحب نے ٹھنڈی سی سانس کھینچ کر کہا "آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ مَیں اِس بات سے بے خبر ہوں۔ ہر آدمی اپنی اپنی جگہ گرفتار ہے۔ ایک آپ ہی تو مبتلا نہیں ہیں۔"

ایک اور شرمیلے سے صاحب بھی اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو کچھ عرض کریں اور اِن قافلے والوں سے پیچھے نہ رہیں۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے "جوڑوں کے درد کا بہترین علاج حفظانِ صحت کے اصول اور باقاعدہ ورزش میں ہے۔ خاص طور پر شراب سے پرہیز ضروری ہے۔"

حاضرین میں سے ایک اور صاحب یہ کہہ کر اِس قول کی تصدیق کرنے والے ہی تھے۔ "جی درست ارشاد فرمایا آپ نے۔" لیکن وزیر صاحب کی پیشانی کے تیور اور ناراضی کو بھانپ گئے اور خود بات کا رُخ بدل کر کہنے لگے

"عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ۔ فلاں خاں جو سو سال کا ہو کر مرا چوبیس گھنٹوں میں دو بھری بوتلیں شراب کی پی جاتا تھا۔ جوڑوں کا درد اُس کو بھی تھا۔ شراب کا اِستعمال اور جوڑوں کا درد دونوں ہی اُس کی طویل العمری کی دلیل ثابت ہوئے"

کہنے والے نے یہ بات کہہ تو دی لیکن سب نے اُسے مِل کر گھیر لیا۔ وہ بیچارہ شکاری کتوں کے غول میں گھرے شکار کی طرح سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور اپنے کہے پر سخت پشیمان ہُوا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میں بھی وحشت زدہ ہُوا۔ گویا بھوکے بھیڑیوں کے درمیان پھنس گیا ہوں۔ لوگ اپنے خیالات کو زہر آلود دانتوں کی طرح چھپائے بیٹھے تھے اور اپنی دماغی قوت اور نگاہ کی بصیرت کو فریب کاری اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے میں صرف کر رہے تھے۔ ساری فضا دروغ گوئی کے تیروں سے دگرگوں ہو چکی تھی۔ جی ہاں میں ان سب لوگوں کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ یہ شخص جس کی تعریف میں آج خوشامد کے پل باندھے جا رہے ہیں، وہ بھی دن تھے کہ لوگ اس سے سخت نفرت کرتے تھے اور اس سے جلتے تھے۔ یہ بیچارہ زندگی بھر بڑی بڑی سفارشیں ڈھونڈنے، دشمنی اور کینہ کی آگ بھڑکانے، مایوسی کا شکار ہو کر دلوں میں نفرت کے بیج بونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اور آج خوش قسمتی سے اِس کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہے تو اپنی کسمپرسی کے زمانے کا انتقام اپنے قدیم ہمدردوں اور ساتھیوں سے یہ سمجھ کر لے رہا ہے کہ وہ سب اس سے کم تر درجے کے لوگ ہیں۔ ایسا بیمار تو وہ پہلے بھی ہُوا تھا جب وہ معمولی آدمی تھا اور علاج بھی ہو گیا تھا مگر اسے مطلق احساس نہیں۔ ساری عمر نا سمجھ رہا اور آج بھی بزعمِ خود یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ عہدہ، یہ منصب خوش قسمتی احسنِ اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس کی قابلیت اور دانشمندی کا ثمر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ استعداد اور قابلیت کی رُوح عہدۂ وزارت کی شکل میں اُس کے جسم میں پھونک دی گئی ہے حالانکہ وزارت نے جس چیز کا اضافہ کیا ہے وہ اس کی بے ضمیری ہے کہ آج اپنے بے بنیاد ارادوں کو وحی آسمانی کی مانند اپنے ہی جیسے انسانوں پر ٹھونس رہا ہے اور جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ان حاضرین میں بھی مَیں نے ایک ایک کو دیکھا بھالا ہے اور خوب جانتا ہوں کہ یہ پہلے صاحب

قبائے حکومت سے بڑھ کر کسی زیب و زینت کو ترجیح نہیں دیتے اور اقتدار سے بڑھ کر اُن کی نظر میں کوئی چیز قابلِ تعریف نہیں ہے۔ افسرانِ بالا کے سامنے نہایت فرمانبردار اور گھٹیا ذہنیت کے مالک البتہ ماتحتوں کے حق میں سخت ظالم اور جلاد ہیں۔ عہدے اور منصب پر ایمان اُن کی فطرت میں جڑ پکڑ چکا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہر صاحبِ مال و جاہ کا یہ دل سے احترام کرتے ہیں اور ہر کمزور اور بے عہدہ شخص سے متنفر ہیں۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر احباب محتاط رہیں کہ اُن سے دوستی کرنے میں پستی کا رُخ نہ کریں۔

دوسرے صاحب ہر صاحبِ اقتدار اور بڑے آدمی سے بیزار ہیں اور خاص کر اُس سے جو اُن کے سر پر مسلّط ہے۔ یہ اُس کو اپنا جانی دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نشہ باز نہیں کہ افسر کو نشہ باز بنا کر کامیابی حاصل کروں۔

تیسرے صاحب ہر وقت آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے رہتے ہیں کہ اے خدا جس قدر بدبختیاں اور نحوستیں ہیں اُن کا نزول میرے خیر خواہ بھائیوں کے حق میں فرما۔

چوتھے بزرگ بے انتہا ظالم اور سخت ڈرپوک واقع ہوئے ہیں۔ ہر وقت کھُسر پھُسر میں لگے رہتے ہیں اور دو آدمیوں کو لڑانے بھڑانے میں کوئی اُن کی برابری نہیں کر سکتا۔

مختصر یہ کہ میں اپنے رفقاء کے عیبوں کو اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر دل کی گہرائیوں میں اُتارتا رہا اور ہر شخص کی کمزوریوں پر ٹکٹکی جمائے رہا۔ جب کوئی کہہ چکتا تو میں بات کا سرا پکڑ کر نئے عیب تلاش کرنے لگتا یہاں تک کہ میرا ذہن تھک گیا اور لوگوں کی طرف میری توجہ سرسری سی ہو گئی۔

پھر میں نے اپنے دِل میں جھانک کر دیکھا تو دوسروں کے عیب خوُد میری شخصیت میں وجود میں سرایت کر چکے تھے۔ میں نے اپنے اندر حسد اور کینہ کا دہکتا ہوُا الاؤ پایا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ گردشِ فلک کے ہاتھوں مجھ پر ظلم ہُوا ہے کہ آج مَیں وزیر نہیں ہوں۔ میرے مقدر نے میری صلاحیت اور قابلیت کی طرف سے آنکھیں موند لیں اور نااہلوں کو میرا مقام سپُرد کر دیا ہے۔ کم از کم ان کو میرے چھینے ہوئے رُتبے کا خیال کر کے احترام بجا لانا تھا۔ افسوس کہ اُنہوں نے مجھے مسندِ وزارت پر جگہ نہ دی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ غمگساری، خوشامد، علاج کے طریقے، حضور میں شرفیاب نہ ہو سکنے کی محرومی اور ایسی ہی ہزاروں دل نشیں باتیں اپنے ضمیر یعنی ایک وزیر سے جاری رکھوں۔ اِسی دوران میں اُن احساسات پر بھی غور کر رہا تھا جو اس صورتِ حال کے برخلاف میرے دل میں امڈ رہے تھے۔

جب زیادہ غور کیا تو معلوم ہُوا کہ میری آرزوؤں کا قبلہ بھی یہی جاہ و منصب اور مال و دولت ہے اور انہی کو میں زندگی کی اعلیٰ ترین نعمتیں سمجھتا ہوں۔ مجھ میں بھی صاحبانِ مقام اور اہلِ دولت سے نفرت کا جذبہ موجود ہے۔ میری ہر خواہش، ہر تمنّا دوسرے کو نقصان پہنچا کر پوری ہوتی ہے لیکن اپنے مفاد کو میں استحقاق سمجھتا ہوں اور دوسروں کا نقصان میرے نزدیک بے معنی چیز ہے۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے اپنے ساتھیوں کی تحقیر اور غیبت سے مجھے ڈھیر ساری لذتیں حاصل ہو رہی ہیں اور میں کسی بھی اقدام سے درگذر نہیں کرنا چاہتا خواہ اِس سے زندگی کی قدریں ہی پامال کیوں نہ ہوں۔ میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ "ہر چہ خوباں ہمہ دارند" تنہا میری ذات میں موجود ہے۔

خود شناسی کی یہ دولت میرے ہاتھ آئی تو ساتھیوں کے چہرے اور اُن کی گفتگو کا حاصل سب بدل گئے اب میں خود کو بھی اُن کا شریکِ جرم سمجھنے لگا۔ یکایک چشم پوشی، لطف

اور درگذر کا نیک جذبہ میرے سابقہ جذبات پر چھا گیا اور حسد، بغض اور کینے کی وہ زنجیریں جنہوں نے مجھے بُری طرح جکڑا ہُوا تھا تنکوں کی مانند بکھر گئیں۔ اُس دن کے بعد میں صرف اپنے عیب ٹٹولنے میں مشغول رہتا ہوں۔ جب دل کے سیاہ خانے میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو ہر گھڑی ایک نیا عیب، ایک تازہ خرابی نظر آتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

دِل چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو دوسروں کے دلوں کا حال معلوم کروں لیکن افسوس ہے کہ دلوں کے دروازے تو صاحبِ دل ہی کھول سکتا ہے۔ خیر افسوس کی کیا بات ہے سبھوں کا حال کِسی حد تک میری ہی طرح ہے۔ علاوہ ازیں خود اپنے ضمیر کا تماشا دیکھنے سے فرصت کہاں ہے کہ دوسروں کی طرف توجہ کروں لیکن کوئی لذّت اور راحت بغیر رنج کے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ تمام مصروفیات زحمت کے بغیر نہیں ہو سکتیں۔ نفس پر اِتنا ضبط اور قابُو ہونا چاہیئے کہ اپنی مکروہ صُورت دیکھ کر وحشت نہ ہو اور اپنے عیوب کی ناپاک صُورت پر مصنوعی خوبصورتی کا زرّیں نقاب نہ ڈالے۔

اِس جہادِ نفس سے ہزاروں مشکلات میرے لئے آسان ہو گئیں۔ اب میں اہلِ دنیا سے اُلجھنے کی بجائے اُن پر عفو و شفقت کی نظر ڈالتا ہوں۔ بدکاروں اور بدسیرتوں پر سختی کرنے کی بجائے یہ سوچ کر معاف کر دیتا ہوں کہ اُن سے زیادہ عیب خود میری ذات میں ہیں۔

خوشدِ امن

میرا ایک ساتھی ہے جس نے کبھی نقاشی نہیں کی نہ کبھی شعر کہے ہیں لیکن فطرتاً نقاش اور شاعر ہے جس بات کا وہ ادراک کرتا ہے ہم نہیں کر سکتے۔ پھول، سبزہ اور ہر بے زبان کے ساتھ ایسی باتیں کرتا ہے جنہیں ہم نہیں سمجھتے ہر وقت حُسن کے پیچھے ہے لیکن جس خوبصورتی کو وہ پسند کرتا ہے اُس کے ساتھ ہزاروں شرائط ہیں جن کو وہ خود ہی جانتا ہے لیکن بتا نہیں سکتا۔ اِسی وجہ سے زندگی کا ساتھی حاصل نہیں کر سکا۔ اور عمر کا ثمرہ نہیں پا سکا۔

ایک مہینہ پہلے میرے پاس آیا کہ اب مدد کا وقت ہے۔ اگر تو واقعی میری خوش نصیبی چاہتا ہے تو اپنے فائدہ یا عزتِ نفس کو خیر باد کہہ۔ اور میری خاطر ذلت بھی برداشت کر لے۔ میں نے کہا وہ خواہش جو دوست کی خاطر ہو ذلت نہیں ہے اگر ہے بھی تو اِس میں ایک لذت ہے ایسا گھٹیا زمانہ آگیا ہے کہ اِنسان صرف اپنا فائدہ ڈھونڈتا ہے اور اپنے لئے دوسروں کی منت زاری کرتا ہے۔ اگر تو پُوچھے کہ ایسا کیوں ہے تو اِس کا جواب میرے پاس نہیں لیکن یہ امر ایسا قدرتی ہے کہ عقلمند و بیوقوف تمام خود غرض انسان سے نفرت کرتے ہیں جبکہ عاشق کی پرستش کرتے ہیں عشق کی راہ میں جتنا بھی کوئی ذِلت برداشت کرتا ہے دوسروں کی نگاہوں میں وہ اتنا ہی عزیز ہے لیکن اپنے فائدے کے لئے جو قدم بھی اُٹھائے گا دوسروں کے دِلوں میں تیری قدر اتنی ہی گھٹتی چلی جائیگی۔ ظاہری احترام جو طاقتور لوگوں کے لئے کیا جائے یا ڈر یا لالچ سے کیا جائے اُسے لازمی حقیقت نہ جاننا چاہیے۔ حیرانی سے تیرا منہ کھلا ہے اور اِس معما کا راز جاننا چاہتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اُس وقت تیری خوش بختی کو نفسیات کے اسباق سے زیادہ چاہتا ہوں۔ جلدی بتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں جس سے تو خوش ہو جائے۔

اُس نے کہا فلاں شریف آدمی کی بیٹی کو مَیں نے دیکھا ہے اُسے پسند کر کے شادی کی درخواست بھی کی ہے کبھی وہ یہ عذر کرتے ہیں کہ ابھی اِس کی شادی کا وقت نہیں آیا۔ کبھی کہتے ہیں اسکی منگنی ہو چکی ہے۔ مطلب یہ کہ میں اُن کی بیٹی کے لائق نہیں ہوں۔ کیا کروں۔ غلطی کی ہے اِس خیال سے کہ آراستہ دل و دماغ، نقدی اور دنیاوی جگہوں سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ پائیدار ہوتا ہے پیسے جمع کرنے کی بجائے جتنا بھی میں کر سکتا تھا اپنے دِل و دماغ

اور خیالات کی خوبصورتی اور زینت و سجاوٹ کی طرف کوشش کی ہے۔ اب دیکھتا ہوں کہ یہ روحانی و قلبی، حسن و عظمت کسی کو نہیں دکھا سکتا اور یہ اوصاف پیسے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ رُتبے او شان والے اشخاص مجھ جیسے فقیر انسان کو اپنی بیٹی حوالے نہیں کر سکتے حالانکہ اگر صحیح انداز سے غور کریں تو میرے اور اُس کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ مَیں بھی غذا کھاتا ہوں، سوتا ہوں اور وہ بھی اپنی تمام عظمت و شان کے ساتھ یہی کچھ کرتا ہے سوائے اِس کے کہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ دُنیاوی اشیأ کی کچھ مقدار جو فضا میں کچھ حجم رکھتی ہے اُس کی ملکیت ہیں لیکن اِن تمام مشکلات کے باوجود مَیں وہ لڑکی تہِ دل سے چاہتا ہوں کیونکہ مَیں جانتا ہوں کہ تو اُس کے باپ کا گہرا دوست ہے ۔۔۔ یہ سچ ہے کہ مَیں لڑکی کے باپ سے خاصا ربط و میل جول رکھتا ہوں اور اُس کے ذہنی رجحانات سے آشنا ہوں اور اِسی وجہ سے میں نے دیکھا کہ یہ ملاپ نہیں ہو سکے گا لیکن مَیں اپنے دوست کے لجاجت آمیز چہرے اور پُرسوز آہوں کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میں نے حقیقت کو چھپایا اور کہا: سر آنکھوں پر۔ میں کوشش کروں گا۔

میں لڑکی کے والد کے پاس گیا اور جتنا بھی کر سکتا تھا اپنے ساتھی کی نیکی، اعلےٰ اوصاف اور معلومات کے متعلق بتایا۔ دلائل دیئے، مثالیں دیں کہ مرد اور عورت اگر ایک دوسرے کے ساتھی نہ ہوں تو ہزار دولت کے ہوتے ہوئے بھی خوش بختی کی زندگی نہیں گذار سکیں گے دو شخصوں کی نیک بختی اُس وقت ہوتی ہے کہ دونوں یا کم از کم ایک نیک پاک اور دانا ہو۔ میرا یہ ساتھی اخلاق و وفا رکھنے والا ہے اگر میرے پاس دس لاکھ بھی ہوں۔ تو اپنی بیٹی اس کے حوالے کر دیتا اور یہ رقم بیٹی کو جہیز میں دے دیتا۔ وہ شخص جو یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اپنی عقل اور کوشش سے مال و مرتبہ کو پہنچا ہے اور درماندہ لوگوں کی باتوں پر ہنستا ہے وہ شاید یہ کہے کہ یہ سب شعر و فلسفہ ہے۔ وہ بھی میری باتوں پر ہنسا۔ اُس نے کہا۔ جناب! یہ تمام شعر و فلسفہ ہے اگر اُس شخص میں میری بیٹی حاصل کرنے کی قابلیت ہوتی تو اِس وقت تک کوئی بیوی تلاش کر لی ہوتی۔ میں کسی کو خانہ داماد بنانا نہیں چاہتا۔ جائیے اور اپنے جیسی کوئی با اخلاق اور تعلیمیافتہ لڑکی ڈھونڈ لے۔ اُس نے اپنے دیدے میرے مال پر کیوں لگا رکھے ہیں۔

مَیں نے کہا: بس اس لیے کہ اُس کا دل نہ ٹوٹے۔ کچھ سوچتے ہیں۔

اُس نے کہا: عجیب بات کرتے ہیں۔ کیا مَیں نے دوسروں کے نازک دلوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ جہنم تو نہیں ٹوٹ پڑی۔

میں نے کہا: آخر یہ شخص ہر مجلس و محفل میں جاتا ہے۔ تمام اُسے پسند کرتے ہیں۔ اچھا نہیں کہ تمہاری بدگوئی کرے۔

اُس نے کہا: جو بکواس بھی کرنا چاہتا ہے کرے عقلمند جانتے ہیں لیکن پھر بھی میں تیار ہوں آپ جو کچھ بھی سوچیں درست ہے۔

کافی عرصہ ہم دونوں سوچتے رہے۔ ایک دفعہ یہ بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے کہا۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو رضامند ظاہر کرو لیکن کہو کہ تمہاری بیوی رضامند نہیں۔ اِس بات کو ہم دونوں نے پسند کیا۔ اُس نے کہا خانم زیارت کو گئی ہوئی ہے۔ چاہیئے ایک دو ہفتہ صبر کریں کہ وہ واپس آجائے۔

میں اپنے ساتھی کے لئے خوش خبری لایا کہ لڑکی کا باپ تو راضی ہو گیا ہمیں کچھ صبر کرنا چاہیئے کہ اُس کی خانم زیارت سے واپس آئے۔ اور چونکہ وہ دل کی نرم ہو چکی ہو گی اُس کا واپس پلٹنا آسان ہو گا۔ اِن چند دنوں میں تو عشق اور اُمید کے ساتھ خوشی سے گزار کر دیکھیں پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

لڑکی کی والدہ واپس آئی۔ ایک ضیافت کی محفل منعقد کی گئی۔ ایک طرف جناب آقا اور اُن کی بیگم بیٹھیں اور اُن کے بالمقابل مَیں اور میرا ساتھی بیٹھے تھے۔ ہر موضوع پر گفتگو ہوئی۔ خانم بڑی خوش خلقی اور خوشروئی سے پیش آ رہی تھی۔ میرا ساتھی اپنی ہونیوالی خوشدامن کی حرکات اور نگاہوں کو دیکھنے میں محو تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ وہ اپنی نیک بختی اور بدبختی کو اس ایک حرف میں دیکھتا ہے جو اُس کے مُنہ سے نکلے گا۔ میرا دل اس پر کڑھتا تھا اور چاہتا تھا کہ جتنا بھی ممکن ہو امید کا یہ رشتہ نہ ٹوٹے بلکہ اِس کے بارے میں ایک انقلابِ عظیم آ جائے اور ہمارے تمام کام اِصلاح پذیر ہو جائیں لیکن آخر کار مجلس کو ختم کرنا ہی تھا۔ دل کڑا کیا اور میں نے کہا حاضر ہونے کا مُدعا یہ تھا کہ پری خانم کو اپنے اس عزیز دوست کے لئے طلب کروں حقیقتاً یہ اپنی شرافت اور شائستگی کیوجہ سے اِس خوش بختی کے مستحق ہیں۔ جو کچھ ضروری تھا اُن کے اوصاف کے متعلق عرض کر دیا ہے۔

میرا ساتھی میرے لباس کا دامن پکڑے ہوئے تھا اور کھینچ رہا تھا میں نہ سمجھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اُس نے دامن زور سے کھینچا۔ کن انکھیوں سے میں نے اُسے دیکھا۔ اپنی آنکھوں بھوؤں اور زبان سے کہتا تھا۔ کہ مزید کچھ نہ کہو۔ کافی ہے۔

خوش قسمتی سے خانم اور جناب آقا کے سر نیچے تھے۔ اُنہوں نے ہماری ادا اور اِشاروں کو نہ دیکھا خانم نے سر اُٹھایا اور کہا: خُدا کی قسم میرا پہلا خیال یہ تھا کہ میں انکار کروں لیکن یہ حضرت مجھے اچھے لگے ہیں۔ خانم کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے دیکھا جناب آقا خانم کے لباس کو کھینچ رہے ہیں اور اس کے پہلو میں اُنگلیاں چبھو رہے ہیں۔ میں نے سر جھکا لیا کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں ایک دوسرے کو اشارے سے سمجھا لیں۔ زیادہ وقت نہ گذرا کہ خانم نے کہا۔ نہیں ابھی پری خانم کی شادی کا وقت نہیں آیا۔

میرے ساتھی نے بات کو ٹوکا اور کہا کہ رخصت دیجیئے۔ ناچار اُٹھے اور چل پڑے۔ ابھی کمرے کے دروازے سے باہر نہ نکلے تھے کہ خانم مجھے ایک طرف لے گئی اور آہستہ سے کہا کہ میں پری خانم کو تمہارے اس ساتھی کو دینے پر رضامند ہوں۔ جناب آقا کا خیال نہ کیجئے کل آئیے۔ مجھے ملیں۔ لڑکی کا اِختیار میرے پاس ہے۔

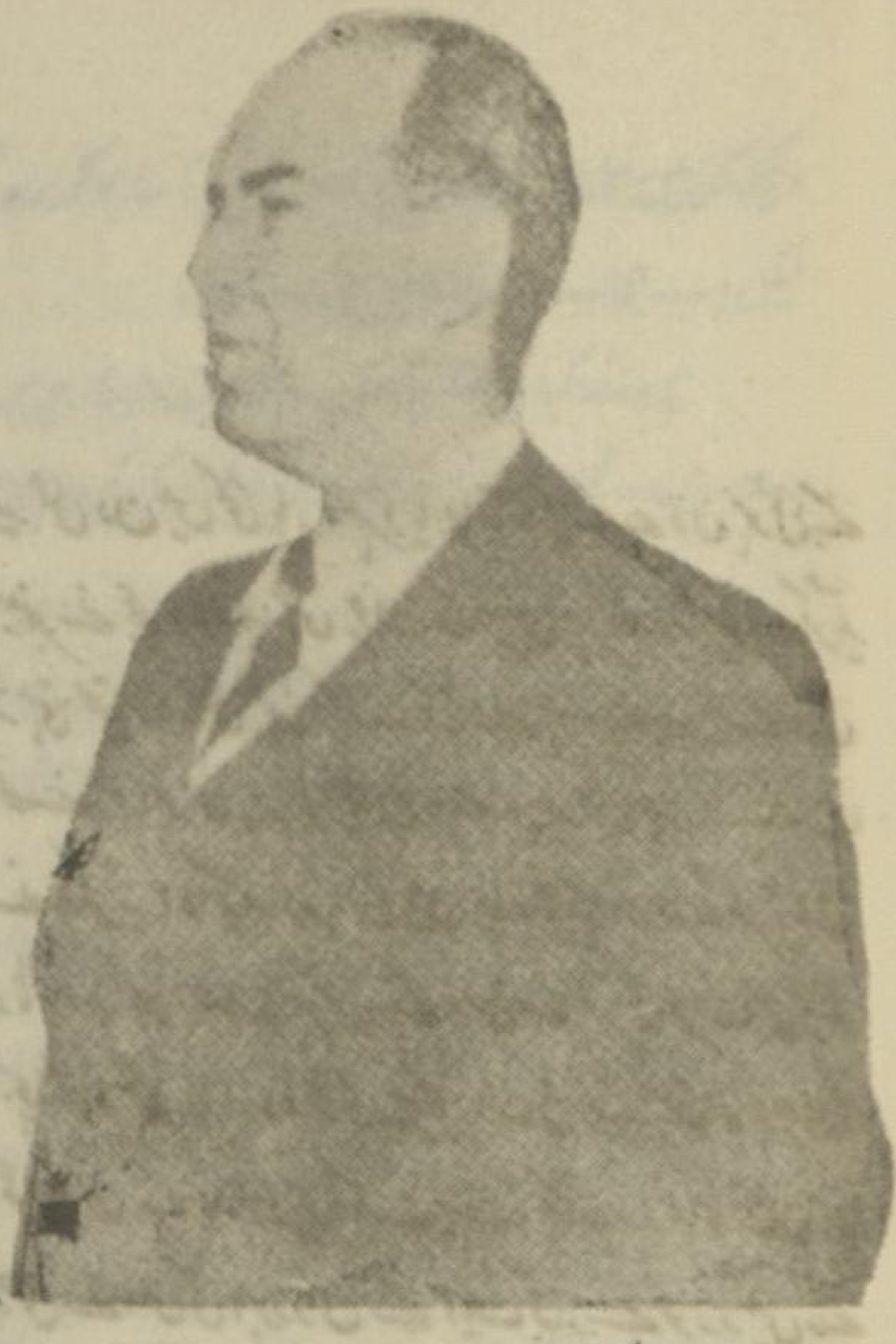
وہاں سے اپنے ساتھی کے پاس پہنچا اور اس کے چہرے سے بھانپ لیا کہ اُس کے دل میں کیا قیامت برپا ہے۔ میں نے کہا۔ تجھے خدا کی قسم بتا تو ناراض ہے اُس نے کہا۔ بہت غصہ میں ہوں۔ میں نے کہا۔ تیرے دل کو تسکین ہونی چاہیئے کہ کام بن گیا ہے۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کہا۔ لڑکی تمہاری ہے کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خانم مجھے ایک طرف لے گئی تھی۔ کہتی تھی میں اس شوہر کو اپنی بیٹی کے لئے پسند کرتی ہوں۔ اختیار میرے پاس ہے۔

اُس نے جواب میں آہ بھر کر کہا۔ کیا فائدہ۔

مَیں ڈرا کہ خدانخواستہ اُس کے حواس تو جواب نہیں دے گئے۔ میں نے کہا۔ میں نہیں سمجھا۔ تو حقیقت بیان کر۔

اُس نے کہا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر حقیقت بیان کروں تو اُس کو سمجھنے کی بجائے تو میرا مذاق اڑائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مَیں نے لڑکی کے بڑھاپے کو اُس کی ماں کی صورت میں دیکھ لیا ہے۔ اور بیزار ہو گیا ہوں۔ جس وقت لڑکی ہنستی ہے اُس کے منہ کے دائیں کونے کا کچھ حصّہ نیچے آجاتا ہے۔ جوان لڑکی کے معاملے میں یہ کوئی بُرا معلوم نہیں ہوتا لیکن وہی حرکت جب میں نے اُس کی ماں میں بھی دیکھی تو مجھے بڑی وحشت آئی۔ صرف یہی حرکت نہ تھی۔ اُس کی ماں کے تمام اعضاء، حرکات، چہرہ اور نگاہیں جو زیادہ تر بھدّی اور بد صورت ہیں لڑکی کی بھی ویسی ہی شکل و صُورت، حرکات اور نگاہیں ہیں جو بوڑھی ہو گئی ہو۔ پس چند سال کے بعد میں ایسی بڑھیا کے ساتھ کیسے زندگی گذاروں گا۔ البتہ قصور میرا ہے کہ شادی کی درخواست سے پہلے میں نے لڑکی کی والدہ کو نہ دیکھا تھا۔ آئندہ جب کبھی میں نے شادی کا ارادہ کیا تو پہلے اُس کی والدہ کو دیکھوں گا۔

کتنا اچھا ہوتا اگر ہم کاموں کے انجام کو اِس "مادرِ زن" کے چہرے کی مانند دیکھ سکیں۔



آقائے محمد حجازی

پری چہرہ



محمد حیات خاں سیال

فارسی کا مکمل عشقیہ ناول

یہ ایران کے ایک نامراد عاشق کی داستان ہے جس نے ایک عورت کے حسن و انداز پر فریفتہ ہو کر اُس کو رفیقۂ حیات بنا لیا اور اپنی رُوح کو عیش کامرانی میں غرق کر دیا، لیکن وہ چوری چھپے دوسروں سے راہ و رسم رکھتی تھی۔

آقائے مطیع الدولہ محمد حجازی (پیدائش ۱۹۰۰ء) بڑی سرشار رُوح کے مالک ہیں۔ سوزِ عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حُسن و عشق کی تخیلی داستانیں اُن کے نثر کے وہ حسین پارے ہیں۔ جو اپنی نظیر آپ ہیں۔ مرحوم ملک الشعرا بہار ایسے شاعر اور ادیب نے کہا تھا: "اگر میں حجازی جیسی شیریں، رواں اور دلگداز نثر لکھ سکتا تو شعر کہنا ترک کر دیتا۔"

آقائے حجازی ۱۹۴۱ء میں "ایرانِ امروز" ایک ماہوار مجلّہ کے مُدیر رہے۔ ۱۹۵۰ء میں نائب وزیر اعظم رہے۔ کلچرل ایسوسی ایشن ایران و پاکستان کے صدر بھی رہے ہیں۔

اُردو ترجمہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال نے کیا ہے اور ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ آقائے حجازی بھی یہ ناول اُردو میں لکھتے تو اسی زبان میں لکھتے۔ (سیّد قاسم محمود)

(۱)

میں یورپ جا رہا تھا جہاز کے لنگر اٹھانے
سے تین دن پہلے ہی بندر پہلوی پہنچ گیا۔ ایک تو اپنے
گھر اور گھر والوں سے بچھڑنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ دوسرے
میں تنہا، نہ کوئی ہمدم نہ کوئی رفیقِ راہ۔ یہ خیال کہ مجھے یہ
طویل سفر اکیلے ہی طے کرنا ہے میرے لیے موجب پریشانی
بن جاتا۔ ہر لحظہ نامعلوم اور نئی سے نئی مشکلات کا سامنا
کرنے کے جرأت مندانہ اقدام اور آمادگی کا خیال آتا تو
دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ اس احساس نے
میری خود اعتمادی کو اجاگر کر دیا تھا۔ مارے فخر کے چھاتی
تان لیتا اور ہوٹل میں سپاہیانہ انداز میں بڑی تمکنت کے
ساتھ اترا کر چلتا۔ کرّوفر کی اس غلط نمائش میں تیزی سے
بولتا اور مختصر سی بات کرتا۔ کبھی جی ہی جی میں اپنی ڈھارس
بندھاتا کہ میں سمندر اور سمندری سفر کی مشکلات سے
ڈرنے والا نہیں اور کبھی اپنے آپ کو یقین دلاتا کہ روسی
زبان نہ جاننے کے باوجود مجھے روس سے گزرنے اور کسٹم
کی مشکلات سے نپٹنے کے خوف کا وہم و گمان تک نہیں۔
کبھی جی میں یہ ٹھان لیتا کہ جونہی پیرس پہنچوں گا میں اپنے
احباب کی ضیافت طبع کے لیے ان تمام واقعات پر اک
سیر حاصل تبصرہ لکھوں گا جو یقیناً ان کے لیے ناقابل برداشت
مصائب سے کم نہ ہوں گے۔ یہ تبصرہ جہاں میری دستارِ
فضیلت میں جرأت و دلیری کا ایک پھول ٹانک دے گا
وہیں ان کی آتشِ حسد کو بھی تیز تر کر دے گا۔ اسی کے ساتھ
ساتھ میں جب کبھی نو وارد مہمان کو ہوٹل میں داخل ہوتے
دیکھتا تو ہوٹل کے مینیجر کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا
"کیا پیرس جانے والا کوئی مسافر ابھی تک نہیں آیا؟" اور
یہ عمل دن میں کئی بار دہرایا جاتا۔ تیسرے دن ہوٹل کے
مینیجر نے مجھ سے کہا جس جوان کی تمہیں ہر روز جستجو اور کرید
رہتی تھی وہ بغل میں ایک کتا لیے ہوئے باغ کے اس
کونے میں کرسی پر براجمان ہے۔ پیرس جا رہا ہے۔ میں
نے شکریہ ادا کیا اور باغ میں جا دھمکا اِدھر اُدھر ٹہلتا
رہا اور کبھی کبھار پیرس کے اس مسافر کی طرف بھی آنکھ
بچا کر دیکھ لیتا۔ وہ قوی ہیکل انسان تھا، تھا تو خوبصورت
مگر اس کے ماتھے پر ایک بہت بڑے زخم کا نشان تھا
جس نے اس کی ابروؤں کے ایک کنارے کو زد میں لے
رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی دائیں آنکھ قدرے
پچک گئی تھی مگر جو چیز دامنِ توجہ اپنی طرف کھینچتی تھی،
وہ تھی اس کی جوانی اور اس پر سر کے بالوں کی سفیدی۔

میں نے سکھ کا سانس لیا اور یوں محسوس کیا جیسے
میرے کندھوں سے ایک سنگین بوجھ اتار دیا گیا ہو۔
تن تنہا اور اکیلے سفر کرنے کی وہ تشویش اور خوف جو
میرے رگ و پے میں تو تھا مگر جس کا میں اعتراف نہیں
کر رہا تھا بالآخر میرے سر سے ٹل گیا۔ میں اس نوجوان
مسافر کے قریب پہنچا اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا
میں نے مہربان شرفا کا سا روپ دھارا۔ پہلے کتے کو
دوستانہ نگاہوں سے ذرا مانوس کیا اور پھر بڑے
مودبانہ انداز میں کہا۔

"کیا جناب بھی پیرس تشریف لے جا رہے ہیں؟
نیم جھکی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑی آہستگی
سے کہنے لگا۔ "فرمایئے کیا ارشاد ہے؟"

اس کی آنکھوں میں یاس و نومیدی کی نیرنگیاں

دیکھ کر میں سخت مایوس ہُوا اور کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔
لیکن اب جواب دیئے بغیر چارہ نہ تھا۔

میں نے کہا، "سنا تھا آپ بھی میری طرح پیرس جا رہے ہیں۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ کم از کم ایک ہموطن تو میرا رفیقِ راہ ہوگا!"

اس نے سر اوپر اٹھائے بغیر ہی آہستگی سے کہا۔ "مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ میں تنہا ہی رہوں۔"

چاہیئے تو یہ تھا کہ اُسے اسی کے حال پہ چھوڑ کر خدا کو سونپتا اور چلا آتا مگر اس کا یہ جملہ کہ میں تنہا رہنا چاہتا ہوں چونکہ عجیب سا تھا جس نے غیر معمولی طور پر میری حسِ تحقیق و تدقیق کو بیدار کر دیا۔ میں نے خیال کیا یہ بیچارہ سختی و بدبختی کا مارا نہ جانے کس ابتلا میں ہے! یا شاید کسی فرد یا گروہ کے ہاتھوں تکلیف اٹھا کر اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر تمام بنی نوع انسان کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے اور اس لیے آدمی اور آدم زاد کے سایہ تک سے متنفر ہے۔ شاید اس کا دل اتنا کڑا ہے کہ اُسے کسی کے ساتھ اور رفاقت کی حاجت ہی نہیں یا نہیں چاہتا کہ اپنی آزردگی سے دوسروں کو بھی آزردہ خاطر بنائے۔ موضوعِ سخن کو بدلتے ہوئے میں نے موسم بہار کی فرحت افزا ہوا اور سبزہ و گل کی شادابی کی بات چھیڑی۔ گیلان کی سرسبزی اور تہران کی خشکی و خشک سالی کا ذکر کیا۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں نے ہرچند کوشش کی مگر اُس نے میری رفاقت کو شرفِ قبولیت نہ بخشا۔ اس کی آواز میں چونکہ اک سوز تھا اور اس کی نگاہوں میں درد و رنج کی طویل داستانیں پنہاں تھیں میں نے بھی بُرا نہ منایا اور چلا آیا۔ لیکن پھر بھی میں بے اختیاری طور پر اُس کے حالات و حرکات کا مسلسل جائزہ لیتا رہا وہ ہر کسی سے کنی کتراتا تھا لے دے کے کتاب ہی اس کی ساری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

ہم اُس جہاز میں سوار ہوئے جس کا نام تبرکمن تھا۔ اگر آپ کو بھی کبھی بحیرۂ خزر عبور کرنے کا اتفاق ہو تو کبھی اس جہاز میں سوار نہ ہو جیئے گا۔ کسی دوسرے جہاز کی آمد کے لیے آپ کو جتنا بھی انتظار کرنا پڑے، بخوشی کیجیے گا! ہماری شومیٔ قسمت سے سمندر میں طوفان تھا۔ ہمارا وہ بیچارہ ساتھی سمندری مرض میں اس بُری طرح مبتلا ہو گیا کہ اُس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ میں اس کی تیمارداری کرنے لگا ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے سرہانے سے دُور نہ ہوتا چونکہ بات کرنے کی بجائے میں سکت ہی نہ تھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اظہارِ تشکر و امتنان کرتا۔ باد کوبہ کی بندرگاہ پر پہنچے۔ جہاز نے لنگر ڈالا تو اس بیچارے کا مزاج بھی ذرا سنبھلا لیکن وہ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ چلنے کی ہمت نہ تھی اُس نے اپنے آپ کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا میں نے بہ کمال مہربانی اُسے سہارا دیا اور یوں خشکی پر پہنچ کر ہم ایک ٹانگہ میں سوار ہو گئے۔

اس شہر کی ناہموار کنکروں سے بنی ہوئی سڑکوں پر ٹانگے کے ہچکولے تو تندرستوں کے چھکے چھڑا دیں ابھی چند منٹ نہ گزرنے پائے تھے کہ نوجوان نے میرا سہارا لیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کا رنگ فق۔ اس حالت میں ہوٹل والوں نے اُسے داخلہ نہ دیا اور ہم نے ہسپتال کا رُخ کیا۔ گھڑی دو گھڑی کے علاج معالجہ کے بعد اُس نے ہوش سنبھالا پتہ چلا کہ وہ دل کا مریض ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس شخص کو یا تو زندگی میں زہر دیا گیا ہے یا اس نے اپنی قوتِ برداشت سے بڑھ کر کوئی کام کیا ہے اور یا محنت کی دلدل میں پھنس کر بے پناہ رنج و آلام کا شکار رہا ہے۔

آخر میری محبت اور خدمت گزاری نے اُس کی

مہرِ سکوت کو توڑ دیا اور نوجوان نے بالآخر مجھے دل کی گہرائیوں سے قبول کر ہی لیا۔

دن میں دو تین مرتبہ اُسے غش آتا۔ ایک غشی کی حالت کے بعد میں نے جب اُسے ذرا مہربان و ملتفت پایا اور اس وجہ سے بھی کہ میں نے اپنی روانگی کو محض اسی خاطر التوا میں ڈال رکھا ہے اُسے اور بھی ممنون پایا۔ تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور سب آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے کہا میرا خیال ہے کہ مجھ سے اتنا اُنس اور لگاؤ تو ضرور پیدا ہو گیا ہو گا کہ اب مجھے اپنی دوستی کا شرف بخشیں اور اسی مفروضہ کی بنا پر میں نے یہ جسارت کی ہے کہ آپ سے پوچھوں کہ ان تین اسباب میں سے جنہیں ڈاکٹر نے بیماریٔ دل کا باعث قرار دیا ہے آپ پر کونسا صادق آتا ہے؟

کچھ دیر کے لیے وہ اپنے خیالات کی دنیا میں کھو گیا اور پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بھرائی ہوئی آواز اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہنے لگا "میں کسی کی دوستی کے قابل نہیں ہیں۔ قسمت کا وہ ہیٹا انسان ہوں جس کی سحر میں بھی شام کی تاریکیوں کی جھلک ہے۔ قضا و قدر کا فیصلہ میرے خلاف ہو چکا ہے۔ میں ایک قاتل ہوں، ہاں ہاں میں ایک گنہگار انسان ہوں جس کی گردن پر ایک انسانی قتل کا جرم ہے۔ بھلا میں کسی سے دوستی کی توقع رکھ ہی کیسے سکتا ہوں" وہ روتا جاتا تھا اور کہتا تھا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑے نرم دل انسان ہو، بڑے نیک نہاد ہو، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ایک زحمت دوں۔ میں جانتا ہوں کہ نیک لوگ ہی اس دنیا کے سنگین بوجھ کو اٹھاتے ہیں اور اب تو خوش قسمتی سے تمہیں یہ زحمت دینے کا میرے پاس ایک بہانہ بھی ہے کیونکہ تم نے خود ہی تو پوچھا ہے کہ میری بیماری کا اصل سبب کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ میں اب اس ہسپتال سے اب زندہ واپس نہ لوٹ سکوں گا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ تم سے ایک تو یہ استدعا کروں کہ جس طرح میرے ساتھ لطیف و محبت سے پیش آتے ہو اس کتے کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھنا اور اسے میرے بھائی کے سپرد کر دینا۔ مجھے یہ کتا اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے تعجب نہ کیجیے گا جس وقت تم میری سرگذشت سے کماحقہ واقف ہو جاؤ گے تو تم مجھے حق پر پاؤ گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حال کے پچھلے دو ماہ میں میں نے اپنی زندگی کے جو حالات سرزمینِ وشت میں لکھے ہیں، وہ ہر کسی کو پڑھنے کے لیے دیجیے، ہو سکتا ہے کہ میری کتابِ زندگی کا مطالعہ کر کے بعض لوگ اُن مصائب و آلام سے، جو مجھے پیش آئے، محفوظ رہ سکیں۔ ضمناً قارئین میرے اعمال کا جائزہ لے کر فیصلہ بھی کر سکیں گے۔ اگر انہوں نے بھی میرے خلاف فیصلہ صادر کیا تو یقیناً میری رُوح ابد تک عذاب میں رہے گی اور اگر انہوں نے مجھے قابلِ عفو سمجھا تو کم از کم مجھے بدنامی کے کلنک کے ٹیکے سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ کتاب کے آغاز میں یہ اضافہ کر دیجیے گا کہ میں حلفیہ طور پر اس امر کی ضمانت دیتا ہوں کہ ان واقعات میں ایک لفظ بھی حقیقت کے خلاف نہیں بلکہ کتنی کہنے والی باتیں تھیں جو میں نے اس لیے حذف کر دیں کہ مبادا اُسے مبالغہ یا ذاتی خودستائی سے منسوب نہ کر دیا جائے۔ حقائق سے اگر کہیں انحراف ہے تو محض ناموں کے ادل بدل میں ہے۔ میں نے واقعات کے مقام کے تعین سے پہلوتہی کی ہے اور جگہوں کے سلسلہ میں اجمال و اختصار سے کام لیا ہے۔ وہ کتابچہ میرے بیگ میں ہے اُسے اٹھائیے اور اپنے کمرے میں لے جائیے گا آپ اسے ایک دو گھنٹوں میں پڑھ سکیں گے لیکن پہلے یہ قول دیجیے گا کہ مطالعہ کے بعد آپ اپنا فیصلہ بلا کسی رو رعایت کے دو ٹوک دیں گے اور

اور مجھ پر قطعاً رحم نہ کھائیں گے۔

یہ کہہ کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

(۲)

میں اٹھا اور کتابچے کو سوٹ کیس سے نکال کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ دروازے بند کر لیے اور بے تابی سے ورق گردانی کرنے لگا۔ لکھا تھا۔

میری دکان پر عورتوں کی آمدورفت عام تھی۔ کاروبار خوب ترقی پر تھا۔ دو سو تومان کا قلیل سرمایہ دو سال کے عرصے میں پانچ ہزار تومان تک جا پہنچا۔ کاروبار کی ترقی کی ایک وجہ میری وجاہت بھی تھی۔ جب سے مجھے اس بات کا احساس ہوا اپنی طرف متوجہ ہوگیا۔ ہر روز آئینہ دیکھتا، بالوں کو سنوارتا۔ لباس کا خاص خیال رکھتا۔ غرض کہ خوشی کے دن تھے۔ گاہک کو مال دکھاتے ہوتے اپنے ہاتھوں کی نمائش کرتا تھا۔ اچانک پریچہر آئی۔ اس نے اپنی خوبصورتی سے مجھے موہ لیا۔ اور عشق کرنا سکھا دیا۔ کاش میں خوب صورت نہ ہوتا کیونکہ یہی خوب صورتی میری مشکلات کا سبب بنی

پریچہر پہلے پہل اپنی خادمہ کے ساتھ میری دکان پر آئی۔ میں نے کوئی توجہ نہ کی۔ شادی کے بعد وہ کہتی تھی تم کس قدر سرد مہر تھے چھ ماہ تک محبت کے الفاظ دہراتی رہی مگر تم سمجھے ہی نہیں۔ کبھی کبھار نظر کر لیتے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔ میں پریشان تھی۔ خیال کرتی تھی کہ دکان دار سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ عشق کے باریک رموز اور نازک احساسات سمجھ سکے۔ شرمندہ بھی تھی کہ ایسے بدمزاج سے کیوں رسم آشنائی پیدا کی۔ لیکن عشق نے مضبوطی سے میرا گریبان پکڑ لیا تھا۔ سوچتی تھی، شاید کسی اور کو دل دے بیٹھے ہو۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ہاتھ بڑھایا تھا تاکہ تم کلائی پر گھڑی باندھ دو۔ انتظار کرتی رہی کہ تمہارے لب میرے ہاتھوں پر پہنچ جائیں گے۔ میرا تن لرزنے لگا۔ مگر تم کتنے سنگ دل ہو یا بزدل کئی بار جب اسباب میرے حوالے کرتے تو میں جان بوجھ کر گرا دیتی تھی۔ تم پھر اٹھا دیتے تو اس کو رغبت خیال کرتی اور خوش ہوتی۔ جہاں کہیں تمہاری دکان کا نام سنتی تمہارے متعلق لوگوں کے احساسات معلوم کرتی۔

اچانک پریچہر آئی۔ اُس نے اپنی خوبصورتی سے مجھے موہ لیا اور عشق کرنا سکھا دیا

اس زمانے میں پریچہر اس قسم کی راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی۔ ایک جمعہ کی صبح میں بیٹھا تھا۔ پریچہر میرے پاس تھی۔ ایک ہاتھ سے میرے بالوں سے کھیل رہی تھی اور دوسرا ہاتھ، میرے بٹنوں پر تھا۔ وہ باتیں کر رہی تھی، اچانک میرے بالوں کو سونگھا اور کہا کتنا اچھا عطر ہے! علی جان! تم نہیں جانتے مجھے کتنا پیارا ہے۔ قربان ہو جاؤں آخر میرے دام میں آ ہی گئے۔ جیسا کہ میں چاہتی تھی ویسا ہی ہوا، اب کتنے خوبصورت کپڑے پہنتے ہو۔ کیسی میٹھی باتیں کرتے ہو، پہلے تو باتیں کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ پہلے تمہارے جوتے گرد آلود ہوتے تھے۔ جرابیں پھٹی ہوئی۔ ایک تاجر بچہ تھے۔ اب ایک خوب رو جوان۔ اے کاش تمہارا قد بلند ہوتا۔ لیکن نہیں کوئی عیب نہیں۔ ہر چیز درست ہے۔

پھر کہتی "تمہارے لیے میں نے ماں باپ عزیز و اقارب کو چھوڑ دیا ہے۔ صرف تمہاری خاطر۔ میرا باپ عشق ہے۔ میں ہر چیز تمہارے لیے قربان کر سکتی ہوں وہ چاہتے تھے مجھے پرویز سے بیاہ دیں۔ گویا مجھے

پہچانا چاہتے تھے۔"

کاش میں اتنا تجربہ کار ہوتا اور اس کے کلمات کو سمجھ سکتا۔ اس کی فطرت کو پہچان سکتا۔ مگر میں اس کے جمال پر مفتون تھا۔ اس کے سوا کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ پری چہر کی صورت غنچہ کی مانند، نیلی آنکھیں، سنہری بال، نازک ابرو، بلند قامت، گورا رنگ، ہاتھ اتنے نازک کہ دیکھنے سے آنکھوں میں تازگی آئے۔ ناخنوں کی آرائش کا وہ خیال رکھتی تھی۔ کبھی وہ ہاتھوں کو میز پر رکھ دیتی اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی اور کہتی ملی جان! تم نے کئی ہاتھ دیکھے ہوں گے کبھی ایسے ہاتھ بھی دیکھے ہیں۔ پھر آہستہ سے نرم و نازک ہاتھ اٹھاتی اور میرے لبوں کے قریب کر دیتی۔

کبھی بٹنوں سے کھیلنے لگتی تو میں اس کے ہاتھ پکڑ کر چوم لیتا اور کہتا۔

"میرے چاند! شادی کیے دو سال ہو چکے ہیں۔ عشق ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ زندگی کا پورا لطف —— میں شروع میں تیری باتوں کو نہیں سمجھتا تھا۔ تو سچ کہتی ہے۔ شرمیلا تھا۔ اگر خود تو اظہار محبت نہ کرتی تو میں کبھی ایسی حرکت نہ کرتا —— اگر تیرا عشق بیدار نہ ہوتا تو میری زندگی کتنی بے کیف ہوتی —— اور جب میں نے بتایا کہ ایک صد پچاس ہزار تومان جمع ہو چکے ہیں تو کہنے لگی "میری ضروریات کے لیے کافی نہیں ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک شہزادی کی طرح زندگی بسر کروں۔ تمام میرے زیر فرمان ہوں۔ لوگوں کے دلوں کے ساتھ کھیلوں۔ معلوم نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔ بہر صورت زیادہ رقم پیدا کرو۔"

میں رنجیدہ ہوتا اور کہتا:- "کیا میرا عشق کافی نہیں ہے؟"

وہ مسکرانے لگتی اور میرے سر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیتی۔ "تم کتنے اچھے ہو۔ تمہارے خیالات میں پراگندگی نہیں۔"

میں خیالات کے اتھاہ سمندر میں گم ہو جاتا مگر کسی چیز کا اظہار مشکل تھا۔ پری چہر میرے متغیر حالات کو بھانپ جاتی، مسکراتی اور اپنی زلفوں کو میرے چہرے پر ڈال دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ میرا دل اس کی زلفوں میں پھنس چکا ہے۔ وہ مطمئن تھی اور جب میں کہتا کہ میں اپنی جان کو بھی تیری رضا کے لیے قربان کر دوں گا تو کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ جاتی اور غم زدہ صورت بنا کر کہتی"۔ اے کاش خدا نے مجھے بھی تیرے دل جیسا دل دیا ہوتا"

—— مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں جوان تھا، فلسفی نہ تھا۔ اس کے حُسن کی تعریف کرتا۔ بوسے لیتا اور کہتا میں تمہارے ہی لیے پیدا ہوا ہوں۔

ہمارا گھر بڑا نہ تھا۔ لیکن سامان آرائش کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ پری چہر کی فرمائش پر ایک یورپین نمونے کے مطابق بنوایا گیا تھا۔ پچیس ہزار تومان خرچ ہوئے تھے۔ میں پری چہر کی خاطر ہر چیز کی قربانی دے سکتا تھا۔

پری چہر ہر وقت میرے دل کو ہلاتی تھی اور میں اس کے حُسن میں محو ہو کر رہ جاتا تھا۔ لیکن اب اس کا خیال لانا —— ہائے میرا جگر داغ داغ ہے۔ گلا گھٹ رہا ہے۔ آنسو نہیں تھمتے —— لیکن مجبوراً لکھ رہا ہوں اگرچہ ہر جملے کے ساتھ جان باہر آتی ہے۔

(۳)

دوست معشوق کی جگہ نہیں لے سکتے اور معشوق دوست کی برابری نہیں کر سکتے۔ عشق فرد کو ہر تمنا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ لیکن یہ شعلہ جلد بجھ جاتا ہے تو پھر دوستی کی یاد آتی ہے۔

۱۸ تاریخ کو فریدون فرانس سے لوٹا۔ میں دو تین مرتبہ اس کی ملاقات کو گیا۔ جب دیکھا کہ علم و دانش میں

کمال حاصل کر چکا ہے تو اس کا گرویدہ ہو گیا اور گہرا دوست بن گیا۔

اب فریدوں جیسا دوست اور پریچہر جیسی محبوبہ ——— مست و سرشار تھا۔ دنیا کی کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ یہ کبھی خیال نہ آتا تھا کہ ایک روز یہ سب رشتے ٹوٹ جائیں گے۔

فریدوں بلند قامت اور خوش وضع نوجوان تھا۔ لیکن پہلے میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرح میرا دوست بنا۔ میں تبریز میں پیدا ہوا تھا جہاں میرا باپ تجارت کرتا تھا۔ دس سال کی عمر میں مجھے چچا کے یہاں تہران بھیج دیا گیا تاکہ تعلیم حاصل کروں۔ لیکن پڑھائی میں کمزور تھا۔ میرے ہم جماعت میرا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک روز ایک ساتھی نے تھپڑ مارا۔ میں بھی ہاتھا پائی پر اتر آیا۔ سب اس کی امداد کو آ پہنچے اور قریب تھا کہ پٹتا کہ فریدوں میری مدد کو آیا۔ میں بھی جوش میں آ گیا۔ اینٹ کے ٹکڑے اٹھائے اور انہیں مارنا شروع کر دیئے۔ ایک لڑکے کی پیشانی زخمی ہوئی اور خون بہہ نکلا۔ بعض کہتے فریدوں نے مارا ہے۔ میں کہتا میں نے مارا ہے۔ اتفاق سے میں بیمار ہو گیا۔ جب چند دنوں کے بعد سکول پہنچا تو پتہ چلا کہ فریدوں کا نام لیا گیا ہے اور اسے سزا دی گئی ہے۔

ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں نے فریدوں کو درندوں سے بچایا ہے اور تمام مال و اسباب اس کے حوالے کر دیا ہے۔ کئی روز تک ذہنی پریشانی میں مبتلا رہا۔ آخر ایک روز ایک کاغذ لکھا اور اس کے حوالے کر دیا۔ لکھا تھا۔

"میرے پیارے دوست فریدوں!

میرا گناہ کیوں اپنے سر لیا۔ تو نے ایسا کام کیا ہے کہ میں رات دن پریشان ہوں۔ کہو کس طرح تلافی کروں؟"

فریدوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا اور کہا "تم میرے بھائی ہو۔ تلافی کی کیا ضرورت ہے"۔

میں روتا ہوا چلا گیا اور ہیڈ ماسٹر کو اصل واقعہ سے آگاہ کیا۔

فریدوں مجھ سے پانچ سال بڑا تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی اور میں گیارہ سال کا تھا۔ چار سال بعد اس کے باپ نے اسے فرانس بھیج دیا۔ میں لندن چلا گیا۔ تین سال وہاں رہا۔ لیکن باپ کی وجہ سے مجبوراً واپس آنا پڑا۔ چچا سے دو سو تومان لیے اور کاروبار شروع کر دیا۔ اس وقت میری عمر بیس سال تھی۔ دو سال بعد دلربا سے ملاقات ہوئی اور سات ماہ بعد شادی کر لی وہ مجھ سے دو سال بڑی تھی۔

جنگ کے دوران میں اس کی مالی حالت اچھی نہ رہی۔ کبھی مجھ سے کوئی چیز قبول نہ کی۔ فریدوں میرے ہر راز سے واقف تھا۔ پریچہر اور میرے تعلقات سے وہ پوری طرح آگاہ تھا۔ لیکن کبھی پریچہر سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔

وہ خصوصاً اصرار کرتا تھا کہ پریچہر کے بارے میں محبت میں اعتدال سے کام لوں۔ مگر پریچہر کا عشق میرے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ کوئی کس طرح رخنہ ڈال سکتا تھا۔

ایک دن کہنے لگا اگر پریچہر بے وفائی کرے تو کیا کرو گے؟

اگر میری عورت مجھ سے بے وفائی کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے محبت نہیں۔ پھر ایک دفعہ کہا کہ وہ عورت جو والدین کے گھر سے بھاگ نکلی ہے اور ہر چیز عشق پر قربان کر دیتی ہے قابلِ اعتماد نہیں۔ کیونکہ وہ عشق کے سوا کسی قانون کی پابند نہیں۔ جب یہ آگ سرد پڑ گئی تو گرفتار پرندے کی طرح فوراً اڑ جائے گی۔ یہ مجھ پر حملہ تھا۔

میں یہ کلمات سن کر برداشت نہ کر سکا اور غصے میں کہا "لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ منطق ہر جگہ صحیح نکلے میرا عشق تو روز بروز بڑھ رہا ہے کیونکر کم ہو سکتا ہے"

فریدوں نے قدرے سوچ کر کہا "آپ نے خواہ مخواہ اپنے اوپر یہ بات چسپاں کر دی۔ میں نے تو حقیقت بیان کی ہے۔ روئے سخن کسی کی طرف نہ تھا۔

اس واقعے کے بعد اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی وہ سمجھ گیا تھا کہ میں پری چہر کی خیانت کو تصور میں بھی نہیں لا سکتا۔

چند روز بعد فریدوں نے پوچھا "کیا تمہیں میری دوستی پر اعتماد ہے" میں نے کہا "میں سو زبانوں سے اقرار کرتا ہوں" وہ بولا "تو مجھے گھر میں نہیں لے گئے پری چہر سے تعارف تو کرایا ہوتا"

یہ خیال درست معلوم نہ ہوتا تھا مگر فریدوں کے احساسات نے مغلوب کر لیا اور بلا تامل کہا "پری چہر بھی ملاقات سے انکار نہیں کرتی۔ یہ غفلت مجھ سے ہوئی ہے۔ آج شام باہم کھانا کھائیں گے"

اس کے بعد اکثر وہ رات کو میرے گھر آتا۔ یا ہم اس کے گھر چلے جاتے۔ اس کی ماں رسا خانم اور اس کی بہن فریدہ خوشی خوشی ملتے۔ فریدوں قصے سناتا اور ہمارا جی بہلاتا لیکن اس خوشی کا کیا خاتمہ اب تکلیف اٹھا رہا ہوں۔

فریدوں کی ملاقات کے تین چار ماہ بعد پری چہر کے عشق میں پھر گرمی پیدا ہوئی مگر اب رفتار میں سابقہ رویہ کے مقابلہ میں فرق تھا۔ کبھی عفت و وفاداری کی باتیں کرتی تھی۔ کبھی مرد اور عورت کے فرائض کے متعلق گفتگو ہوتی تھی۔ تعجب نہ تھا۔ کیونکہ یہ افکار فریدوں کی ملاقات کا نتیجہ تھے۔ میں اس لحاظ سے فریدوں کا شکر گزار تھا۔

فریدوں کا باپ مر گیا اور مالی حالت خراب ہو گئی میں نے کاروبار میں شریک ہونے کی پیش کش کی۔ قرض دینا چاہا مگر راضی نہ ہوا۔ چند روز بعد دو ہزار تومان لایا اور کہا جو چاہیے کیجیے۔

دو تین روز نہیں گزرے تھے اور اس کا روپیہ بھی صرف نہ کیا تھا کہ یورپ والے مال میں پانچ گنا نفع ہوا۔ میں نے فریدوں کے لیے دس ہزار منافع منظور کیا۔ صبح کے وقت دکان میں بیٹھا تھا۔ دراز میں سے چیک بک نکالی اور دس ہزار کا چیک فریدوں کے نام لکھا۔ گویا سنگین بار کو اپنے کندھوں سے اتار رہا تھا۔ ہاں اس نے بچپن میں میرے لیے تکلیف برداشت کی تھی۔ آج میں دس ہزار دے رہا ہوں اگرچہ اس کاروبار میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

چیک لیا اور اس کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں سوچتا گیا کہ اسے جرح کرنے کا موقع نہ دوں گا کہ یہ نفع کیسا ہے۔ کہوں گا تمہارا بخت بلند ہے۔

——— ان خیالات میں کھویا ہوا فریدوں کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھلا تھا۔ صحن میں داخل ہوا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ گھنٹی بجائی کہ اندر سے کوئی آئے اور پوچھوں فریدوں کہاں ہے اور انہیں سمجھاؤں کہ دروازے کو اس طرح کھلا نہ چھوڑا کریں۔ اتفاقاً میز پر پڑے ہوئے خوبصورت پرس پر نظر پڑی۔ تجارتی حس سے مجبور ہو کر آگے بڑھا دیکھا کہ وہی پرس تھا جو دو روز پہلے پری چہر کے لیے خریدا تھا۔ اسی فکر میں پرس کو اٹھایا۔ پری چہر کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ خیال آیا کل رات جب میں گھر پہنچا تھا تو پری چہر کسی کے ساتھ ٹیلی فون پر باتیں کر رہی تھی۔ میری آمد پر پریشان ہوئی اور ٹیلیفون رکھ دیا۔ جب پوچھا تو یہ جواب دیا۔ میری سہیلی فرنگیس نے دعوت پر بلایا ہے۔ بہت اصرار کیا مگر نہ مانی ناچار قبول کرنا پڑا۔ مجھے یہ دعوتیں اچھی نہیں لگتیں۔

میرا ارادہ تھا کہ کل گھر پر ہی رہوں اور کام کاج کروں۔

اسی خیال میں مضطرب کچن کی طرف بڑھا۔ پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ پریچہر اور فریدوں صوفے پر بیٹھے ہیں۔ پریچہر نے چیخ ماری اور بلبلا اٹھی۔ فریدوں ایک مجسمے کی طرح کھڑا میرا منہ تکنے لگا۔

آنکھوں کے سامنے پردہ چھا گیا۔ کان بہرے ہو گئے۔ سر چکرانے لگا۔ دیوار کا سہارا لیا۔ معلوم نہیں یہ حالت کتنی دیر تک رہی۔ فریدوں میرے قریب آیا اور کہا "علی جان! دوستی اور شرافت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کوئی خیانت نہیں ہوئی۔ یہ ملاقات تمہاری بہتری کے لیے تھی۔"

میں نے قہقہہ بلند کیا اور کہا "بے شرم تمہارے منہ سے شرافت کا لفظ کتنا برا لگ رہا ہے؟"

فریدوں کرسی پر گر پڑا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ پریچہر جس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی میرے قریب آئی اور کہا "فریدوں بے قصور ہے۔ تقصیر مجھ سے ہوئی ہے۔"

میں نے چیک کو میز پر پھینکا اور باہر چلا آیا۔

تیز قدم اٹھاتا ہوا بازار پہنچ گیا اور ایک پستول خریدا۔

قتل کا خیال کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ مرغی کو ذبح ہوتے دیکھنا بھی میرے لیے کتنا صبر آزما تھا۔ بہر حال پستول خریدا۔۔۔۔ جیب میں ڈالا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ خیال کرتا تھا کہ لوگ مجھ سے پستول چھین لیں اور میرا درد بٹائیں۔ میری بے چارگی پر آنسو بہائیں اور پریچہر کو اسی حالت میں لوٹا دیں۔ فریدوں کی روح اسی طرح پاکیزہ کر دیں اور یہ تمام منظر جو میں دیکھ چکا ہوں میری آنکھوں کے سامنے سے ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ بنی نوع انسان کو "اعضائے یک دیگر" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ آج کیوں میرے درد میں شریک نہیں ہوتے۔ کتنے بے رحم ہیں، سنگ دل ہیں۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

فریدوں کا گھر چند قدم آگے تھا۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ پستول جیب میں تھا۔ بڑی مشکل سے سیڑھیوں پر چڑھا۔ ان کا نوکر حسن کچن سے

میں نے پستول خریدا۔ جیب میں ڈالا۔ مگر خیال کرتا تھا کہ لوگ مجھ سے پستول چھین لیں اور میرا درد بٹائیں۔

باہر نکل رہا تھا۔ پوچھا فریدوں صاحب تشریف نہیں نہیں رکھتے۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فریدوں گھر میں ہے مگر چھپ گیا ہے۔ خواب گاہ کی طرف گیا تاکہ جلد تمام اپنے مقصد کو پہنچوں۔ اتنے میں رسا خانم کی آواز سنائی دی۔ کہہ رہی تھی "بیٹا کہاں گھوم رہے ہو۔" وہ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ معلوم نہیں میں نے کیا پوچھا جس کے جواب میں اس نے کہا فریدوں ابھی تک واپس نہیں آیا۔

"پریشان کیوں ہو؟ عجیب اتفاق ہے۔ فریدوں بھی آج پریشان نظر آتا تھا۔ بخدا کہو کیا بات ہے۔"

چاہا کہ بتا دوں مگر زبان نہ کھلی۔ اگر ایک کلمہ بھی کہتا آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ ہاتھ سے اشارہ کیا اور باہر چلا گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شہر سے باہر نکل گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش جاری تھی۔ یاد نہیں کیا کیا شکوے کیے۔ کیا کیا کچھ کہتا رہا۔ آخر ایک پتھر پر جا بیٹھا اور دیر تک سوچتا رہا۔

(۴)

آئینے میں جب شکل دیکھی تو اپنے آپ سے

خوف معلوم ہونے لگا۔ پیشانی پر زخموں کے نشانات تھے۔ یاد نہیں کس وقت آئے۔ چاہا کہ پری چہر مجھے اسی حالت میں دیکھے تاکہ میری موت کے بعد اس کا دل جلتا رہے۔

کمرے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھولنا چاہا مگر طاقت نہ تھی زور سے دھکا دیا اور دروازہ کھل گیا۔

چراغ جل رہا تھا۔ پری چہر نے سُرخ لباس پہن رکھا تھا جو ایک روز پہلے خریدا تھا سینے اور بازوؤں کی سفیدی سپیدۂ صبح کی طرح دل کو موہ رہی تھی وہ پہلو کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ رخ میری جانب تھا۔ ایک ٹانگ رضائی سے باہر نکلی ہوئی تھی وہی ٹانگ جس کو گھنٹوں دیکھتے رہنے کا عادی تھا۔ چاندی کے فریم میں جڑی ہوئی میری تصویر تکیہ کے ساتھ پڑی تھی۔ ایک ہاتھ فریم کے گرد تھا۔ پریشان زلفیں لہرا رہی تھیں۔ پری چہر کو کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ سوئی ہوئی تھی یا بیدار معلوم نہیں۔ آنکھیں بند تھیں۔ قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی کا مقصود یعنی عشق و آرزو مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر ہے۔ اگر ہاتھ بڑھاؤں تو پہنچ سکتا ہوں ——— اے خدا عشق کے دشمنوں کی زنجیر میری گردن سے نکال دے اور آتشِ محبت کو روشن کر۔ حسد اور کینہ کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچے۔ خدایا! مجھ سے میری شرافت اور غیرت لے لے اور صرف عشق کو باقی رہنے دے۔ اے خدا میں پری چہر کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

اتنے میں پری چہر نے حرکت کی اور چہرے کو میرے فوٹو پر رکھ دیا۔ میں بے اختیار ہو گیا اور چاہا کہ اپنے آپ کو اس کے قدموں پر گرا دوں اور کہوں اے میرے معبود جو چاہے کر۔ مگر مجھے اپنا دیوانہ سمجھ اور کوئی تقاضا نہیں۔

پری چہر آنکھیں کھول کر یوں گویا ہوئی۔ "علی کتنی دیر لگائی آؤ سو جاؤ۔"

میں خاموش کھڑا رہا۔ اس نے بھی کوئی بات نہ کی اور پھر سو گئی۔ اس بے اعتنائی نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ سوچا کہ جیب سے پستول نکالوں مگر یاد آیا ابھی وصیت نامہ نہیں لکھا ہے۔

وہاں سے ڈرائنگ روم میں گیا۔ پہلے یہ خیال تھا کہ پری چہر کو ورثہ سے محروم کروں لیکن وہ تو میری آخری تسلی تھی ——— شاید کسی دن شرمندہ ہو۔ آخر لکھا:۔

"اے بے وفا پری چہر۔

اگر تمہاری خوشی اسی میں تھی تو میں چلا گیا لیکن تیرا عشق میرے ساتھ ہے۔ اپنے عہد و پیمان کو یاد کر ——— لیکن عہد و پیمان توڑنا ——— تجھے معاف کرتا ہوں اور آخری دم خدا سے یہ استغاثہ کرتا ہوں کہ وہ تجھے معاف کر دے۔ مجھے یقین ہے وہ میری تمنا پوری کرے گا۔

اگلی دنیا میں میری آنکھیں تیرا انتظار کریں گی۔ آؤ کہ اکٹھے ہو جائیں۔ وہاں سراسر عشق و وفا ہے خیانت و بے وفائی کا کام نہیں۔ تمام جائداد تجھے بخشتا ہوں۔ اگر تو چاہے تو پانچ ہزار میرے بھائی حسین کو اور پانچ ہزار تجارت خانے کو دے دینا۔ علی تجھ پر قربان ہو گیا۔

دل چاہتا تھا کہ خودکشی کرنے سے پہلے دیکھوں کہ اس کاغذ کے پڑھنے سے اس کی کیا حالت ہوتی ہے منتظر تھا کہ وہ دروازے سے آئے اور اس کاغذ کو پڑھے۔ قلم کو میز پر رکھا اور پستول کو آزمایا تاکہ وقت پر کوئی دھوکہ نہ دے۔ اتنے میں دروازہ کھلا۔ پری چہر مسکراتی ہوئی داخل ہوئی اور میری گردن میں لٹک گئی۔ کہتی تھی۔

"علی جان! پہلے مجھے مار دے پھر جو چاہے کر۔ تمہارا خیال ہوگا کہ مجھے تنہا چھوڑ کر خود چلے جاؤ گے۔ افسوس صد افسوس۔"

ہر چند کوشش کی کہ اس کے ہاتھوں سے خلاصی پاؤں مگر کامیاب نہ ہوا۔ اسی کش مکش میں پستول کو اپنے کان کے قریب کیا اور گھوڑا دبا دیا۔ آواز گونجی اور میں گر پڑا۔ دیکھا کہ پری چہر مجھے بغل میں لیے بیٹھی ہے اور آہستہ آہستہ کہہ رہی ہے۔

"علی جان! بے گناہ ہوں۔ میں بدبخت ہوں۔ یہ تو نے کیا کیا۔ میری کثیف طبیعت پر لعنت —— میں زیادہ بدنصیب ہوں۔ مجھے کیوں نہ مار دیا۔ میں سب سے زیادہ بدبخت ہوں تو میرے دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ ابھی زندہ ہوں اور یہ الفاظ سن رہا ہوں۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے کہا مرد نہیں۔ مجھے کیوں نہ مرنے دیا۔ کیا تو میری دشمن نہیں؟

مجھے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور بستر پر لٹا دیا۔ کافی دیر تک دیکھتی رہی اور پھر میرے پہلو میں گر پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔

دوسرے دن ظہر کے وقت بیدار ہوا۔ پری چہر میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ کہنے لگی "علی جان! اٹھو۔ آج یہاں سے چلے جائیں۔"

یہ سن کر قدرے راحت ہوئی۔ خیال کیا' اگر میرے ساتھ وہ تعلقات نہ ہوتے تو دوسرے سے ہاتھ کیوں کھینچتی اور میرے ساتھ کہیں اور جانے پر کیوں رضامند ہوتی۔ یقین کیا کہ کوئی خطا نہیں ہوئی۔ اپنے ضمیر پر ملامت کی۔ ہر لمحہ یہ خیال آتا کہ پوچھوں' کل فریدوں کے گھر کیا کام تھا؟ لیکن ڈرتا تھا۔ شاید جواب حسبِ منشا نہ ہو۔

اٹھا اور کپڑے تبدیل کیے۔ مختصر سی غذا کھائی۔ معلوم ہوا کہ سامانِ سفر تیار ہے اور خراسان کی تیاری ہو چکی ہے۔ پری چہر میرے چہرے سے بھانپ گئی کہ میں کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگی علی جان! میں جانتی ہوں کہ تم پریشان ہو۔ جب راستے میں تنہا ہوں گے تو تمام

"اُسے بھول جاؤ۔ کیا میں تمہارے لیے کافی نہیں ہوں۔ میں تمہاری ہوں۔ دوسروں سے تمہیں کیا واسطہ"

حالات سے آگاہ کروں گی۔ تمہارا دل آسودہ ہوگا۔ مطمئن رہو۔"

میں نے کہا' جاتے ہوئے فریدوں سے الوداع کہتے چلیں۔ اس نے کہا "اُسے بھول جاؤ۔ کیا میں تمہارے لیے کافی نہیں ہوں۔ میں تمہاری ہوں' دوسروں سے تمہیں کیا واسطہ"۔ میں اس کی آغوش میں چلا گیا اور سر کو اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کاش اس وقت مجھے معلوم ہو سکتا کہ اس کے دل میں کیا کیا احساسات ہیں اگر مجھے ذرہ بھر بھی خبر ہو جاتی تو یہ تمام مصائب نہ اٹھانے پڑتے۔ افسوس کہ دل کی گہرائیوں میں چشمِ تصور کی بھی رسائی نہیں۔

خراسان جانے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اسمٰعیل نوکر اور وفادار کتے گامن کو ساتھ لیا اور ایک اچھی سی گاڑی کرایہ پر لی۔

میری زندگی کا بہترین دن وہ تھا جو گاڑی کی تنگ فضا میں گزرا۔ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے پری چہر میری آغوش میں سو رہی تھی۔ گویا میری دنیا مجھ سے چھین کر دوبارہ مجھے بخش دی تھی۔ فریدوں کا خیال میرے دل کو پریشان کرتا تھا۔ چاہتا تھا کہ

بھول جاؤں اور پری چہرہ بھی اس واقعے سے متعلق کوئی حرف نہ کہے ـــــ لیکن اگر باز پرس نہ کروں تو بے غیرتی ہے۔ آخر ایک بار موقع مل گیا۔ میں نے پوچھا "اس روز کے نحس واقعے کو بیان کرو اور جاں سوز فکر سے نجات دلاؤ۔ کیا تجھے معلوم ہے میرے دل پر کیا گزری ہے"۔

پری چہر نے سرد آہ بھری اور کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر اس واقعے کو فراموش کر دیا جاتا۔ ڈرتی ہوں کہ تم ناراض نہ ہو جاؤ"۔

"نہیں نہیں جو کچھ ہو کہو"۔

کہنے لگی "دو شرائط ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کے بعد اس کے متعلق کبھی ذکر نہ کرو گے۔ دوسری یہ ہے کہ جو کچھ سنو اس پر غصہ نہ کرو"۔

میں نے کہا پہلی شرائط منظور ہے اور حتی الوسیع ناراض نہیں ہوں گا۔ کہنے لگی ایک شرط اور بھی ہے کہ پری چہر کو سب سے بڑھ کر اپنا سمجھو وعدہ کرو۔

"کیا باتیں کر رہی ہو کیا علی پری چہر سے زیادہ کسی اور سے پیار کر سکتا ہے"؟

"علی جان! میرا بے تاب دل ہمیشہ بے قرار رہتا ہے ـــــ کیا کروں

قصور تو تمہارا تھا کہ فریدوں سے تعارف کرایا۔ میں نے شروع میں پیشن گوئی کر دی تھی کہ دوستی کا رشتہ ٹوٹنے والا ہے۔ اس کی نگاہوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ خیالات پاکیزہ نہیں۔ میرا دل لرزتا تھا سوچتی تھی خدایا کیا ہو گا۔ دو تین دفعہ چاہا تمہیں آگاہ کروں۔ پھر سوچا اس کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا ـــــ حتیٰ کہ ایک روز اس نے اظہار محبت کیا لیکن بیچارے کو شرمندہ ہونا پڑا۔ کیا کرتا۔ اس کا گناہ بھی نہ تھا جس کا دل قابو ہی نہ ہو کیا کرے"۔

میں بہت بے قرار تھا کہا "جلد کہو پھر کیا ہوا۔ اس روز اس کے گھر کیوں گئی تھی"!

"اس روز اس کے گھر گئی تھی کہ اسے صاف صاف بتا دوں اسے سمجھاؤں" ـــــ پھر قدرے سوچنے کے بعد بولی "اس روز وہ سمجھ گیا کہ اصرار سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تمہاری دوستی بھی قائم رہے ـــــ خدا کو منظور نہ تھا تم آ گئے اور مجھے وہاں دیکھ لیا۔ لیکن تم نہیں جانتے فریدوں پر کیا گزری۔ دیوانہ ہونے میں کیا کسر باقی تھی۔ پریشانی اور شرمندگی کی وجہ سے کاغذ بھی نہ کھولا۔ چاہا کہ میں خود اٹھا کر پڑھوں مگر اجازت نہ دی تم نے کیا لکھا تھا"؟

"دس ہزار تومان فریدوں کو بخشش دینے تھے"۔

اس کا رنگ سرخ ہو گیا۔ کہنے لگی "تم عجیب مرد ہو ـــــ یہ کیا کیا"؟

میں نہ سمجھ سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ قدرے خاموشی کے بعد بولی۔ "اس کا خیال تھا کہ آئے اور صورت حالات سے آگاہ کرے میں نے اجازت نہ دی کہ تم کب اعتبار کرو گے۔ ممکن تھا جھگڑا ہو جاتا۔ جو کچھ ہوا بہتر ہوا"۔

میں نے کہا "افسوس ہے فریدوں کو قتل نہ کر سکا"۔

"کیا تم نے دوبارہ اسے دیکھا"؟

میں نے تفصیل سے پوری داستان سنائی۔ وہ ترش لہجے میں بولی "میں تجھے آدم کش نہ سمجھتی تھی اگر تم فریدوں کو مار دیتے تو مجھے اپنے ساتھ نہ پاتے قاتل کو کون دوست رکھتا ہے"؟

فریدوں کی حمایت میں یہ الفاظ سن کر اور پریشان ہوا۔ غصہ میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تو بھی اس سے محبت ضرور کرتی ہے"۔

کہنے لگی" جو دوستی کا اظہار کرتا ہے دل میں جگہ پاتا ہے۔ کیا تم نے نہیں سُنا دل کو دل سے راہ ہوتی ہے' لیکن میں فریدوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ تم قائل نہ ہو۔"

میں غصّے میں ایک کونے میں سرک گیا۔ ایک دن اسی حالت میں گزرا۔ مگر یہ وقت کس قدر مشکل سے کٹا۔

غروب کا وقت تھا۔ پری چہر نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی پھر مسکرائی اور مجھے مسکرانے پر مجبور کیا۔ میں نے اسے آغوش میں لیا اور صبح تک جدا نہ ہوئے قرار پایا کہ گزرے ہوئے کو بھول جائیں اور از سرِ نو ویسا ہی وقت گزاریں۔

چند میل باقی تھے۔ صبح کے تارے نے ہماری بزم کو روشن کیا۔ دیکھا کہ گاڑی غیر معمولی تیزی سے جا رہی ہے۔ اتنی تیز کہ جیسے گرنے کے قریب ہو۔ میں چلایا۔ "اسمٰعیل کیا کر رہے ہو؟"

اس نے سر کو پھیرا کر جواب دے۔ چند گولیوں کی آواز سنائی دی۔ اسمٰعیل نوکر اور گاڑی بان دونوں گر پڑے۔ گاڑی چند قدموں تک چلی اور رُک گئی۔ گھوڑے بھی زخمی ہوئے اور گر پڑے۔ ایک گولی گاڑی میں گزری۔ پری چہر ڈر کی وجہ سے مجھے چمٹ گئی۔ میں نے باہر نگاہ ڈالی تو دو ڈاکو نظر آئے جو ہماری طرف آ رہے تھے۔ انتظار کیا کہ ابھی گولی آتی ہے۔ لیکن خاموشی رہی۔ انہوں نے نزدیک آکر ترکی لہجے میں گرج کر کہا "نیچے اترو۔"

میں دیوانہ وار اسباب کو الٹ پلٹ کر پستول کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پری چہر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ پستول نہیں لائی۔

میں نے گاڑی سے باہر آنا چاہا مگر اس نے نکلنے نہ دیا۔ زبردستی اس کے چنگل سے نکل کر نیچے اترا۔ اور ڈاکوؤں سے کہا، "کیا چاہتے ہو کیوں حملہ کیا ہے؟"

وہ ترکی زبان میں فحش گالیاں دینے لگے۔ لہجے سے معلوم ہوا کہ ترکمان ہیں۔ اتنے میں دو اور بھی آ پہنچے۔ ہر کلمے کے جواب میں بندوق کا دستہ یا مکا کھاتا

"میری عورت سے کلام نہ کرو، ورنہ کلیجہ نکال دوں گا۔" پھر دوسرے ڈاکوؤں سے کہا؛ "لو میں اس کے کان کاٹتا ہوں۔"

تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ لئے گئے۔ ایک کہتا تھا "پیٹ چاک کر دیا جائے" دوسرا شوخی سے کہتا "ایک گولی کافی ہے" آخر فیصلہ ہوا کہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تاکہ ثواب حاصل ہو۔

پری چہر کو باہر نکالا گیا۔ ان میں سے ایک ڈاکو جس کا نام سردار تھا کہنے لگا' یہ میرا مال ہے۔ میں بے اختیار چلّایا اور گالیاں دیں مگر دو تین مکے کھاتے اور بے ہوش ہو گیا۔ پری چہر بھی بے ہوش پڑی تھی۔ خیال کیا کہ شاید مر گئی ہے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ اس سے خلاصی ناممکن تھی۔ اسباب کو گاڑی سے نکال کر گھوڑوں پر لاد لیا گیا۔ اچانک پری چہر نے پکارا۔ میں نے کہا' گھبراؤ نہیں خدا مہربان ہے۔"

سردار نے خنجر میری طرف بڑھایا اور کہا "میری عورت سے کلام نہ کرو۔" ورنہ کلیجہ نکال دوں گا۔" پھر دوسروں سے کہنے لگا "لو میں اس کے کان کاٹتا ہوں"۔

دوسرے نے کہا "میں پیٹ کو" ——— اس اثنا میں مجھے ایک خیال سوجھا اور کہا "میں تمہاری طرح شہر استنبول سے ہوں اور تمہارا ہم مذہب اہلِ سنت ہوں اگر مجھے مار دیا تو روزِ قیامت کیا جواب دو گے؟"

سردار نے کہا "کون ہے تو؟"

"تاجر ہوں اور مشہد جا رہا ہوں۔ مجھے نہ مارو، رقم دیتا ہوں اور اپنی جان خریدتا ہوں" کہنے لگے کتنے تومان دوگے؟ جو کچھ میرے پاس تھا پیش کر دیا۔ تومان لے کر جیب میں ڈال لئے۔ دوسرے نے کہا "تومان یا عورت؟"

سردار نے غصے میں اسے گالیاں دیں اور تھپڑ مارا۔ اس نے مجھے زور سے لات ماری اور کہا "یہ کتا میرا قیدی ہے۔ ہزار تومان لوں گی" دوسرے دونوں میرا مال اٹھا کر چلے گئے۔

سردار گھوڑے پر سوار ہوا اور چل پڑا۔ دوسرے آدمی نے مجھے گھوڑے کے آگے دوڑانا شروع کر دیا۔ جب آہستہ چلتا مار کھاتا۔ راستہ ریگستانی تھا۔ دھڑوں اور ٹیلوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بوڑھا مرد کہنے لگا "اگر ہزار تومان نہ دیئے تو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

میں نے کہا کوئی وسیلہ بتاؤ کہ میرا خط تہران پہنچایا جائے۔ ہزار تومان مل جائیں گے۔" تمسخراً سردار نے کہا "عورت کے کتنے تومان لوگے؟" اس نے قہقہہ لگایا اور کہا "میں اس چور کو دس ہزار تومان میں بھی نہ دوں گا۔"

میں نے کہا "پندرہ ہزار دوں گا۔"

دوسرا کہنے لگا "اپنا سر بھی پندرہ ہزار میں خریدو۔"

اس اثنا میں ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اٹھنا مشکل تھا اس نے مارنا شروع کیا۔ زندگی سے تنگ تو تھا ہی اٹھا اور اس سے لپٹ گیا۔ دو تین مکے لگائے۔ سردار ہنسا اور مذاق کرنے لگا۔ اس نے خنجر نکال کر حملہ کرنا چاہا کہ پری چہر نے دردناک چیخ ماری۔ سردار نے کہا "کیا کرتے ہو ہزار روپے ملیں گے۔ نہ مارو۔" اس کے ہاتھ وہیں رک گئے۔

سردار سستانے کے لیے گھوڑے سے اترا۔ پری چہر کو زمین پر ڈال دیا۔ پھر دوسرے مرد سے کہا "دیکھو یار کیا چہرہ ہے۔ بال کیسے ہیں۔ تمام صحرا میں ایسی عورت نہ ملے۔ تیرے ہزار تومانوں سے بہتر ہے۔" یہ کہہ کر پری چہر کے نزدیک ہوا کہ بوسہ لے میں بے اختیار ہو گیا اور اچانک حملہ کر دیا۔ ایک ہاتھ سے خنجر روکتا رہا۔ دوسرے سے مارتا رہا۔ اب اس کا بوڑھا ساتھی تماشا دیکھتا رہا۔ میں اپنی غیر معمولی طاقت پر متحیر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کئی گنا طاقت ہے اگر اس کا ساتھی بھی مدد کو پہنچتا کچھ نہ کر سکتے۔

استنے میں پری چہر کی دل خراش چیخ نے ہم دونوں کو متوجہ کیا۔ وہ چلا رہی تھی "علی جان! مجھے لے گیا۔ خدا را مدد کو پہنچو۔"

ایک دوسرے کے گریبان چھوڑے۔ دیکھا کہ وہ پری چہر کو گھوڑے پر ڈال کر چل پڑا ہے۔ حملہ کرنے کو دوڑا مگر وہ گھوڑے کو ایڑی لگا کر ہوا ہو گیا۔ گامن پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ میں دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگا۔ سردار دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا۔ چنانچہ چند لمحوں میں وہ دونوں ٹیلے کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

(۵)

سر میں بیابان کی خاک ڈالتا تھا اور نالہ و فریاد بلند کرتا تھا۔ کیا کہوں اس وقت میری حالت کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن چونکہ زندہ ہوں اس لیے مصائب زیادہ خیال نہیں کئے جا سکتے۔ میرا جسم ایک تنگ ظرف ہے جو معمولی ناخوشی اور مشقت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ سر اور چہرے کو ناخن سے چھیلتا تھا۔

کتنا عرصہ اسی حالت میں گزرا معلوم نہیں۔ موت کا انتظار تھا اور بس۔ چند روز پہلے خودکشی کے لیے تیار تھا مگر اب موت سے ڈر رہا تھا۔ زندہ رہنے کی آرزو تھی تاکہ پری چہر کو حاصل کرسکوں۔ تمام دنیا پری چہر تھی۔ دنیا سے ہاتھ اٹھانا مشکل۔

کمزوری کی وجہ سے قدم اٹھانا دشوار تھا۔ تصورات کی دنیا میں پری چہر کو دیکھتا تھا کہ سفید کبوتروں کے غول پر بیٹھی آسمان پر مائل پرواز ہے۔ میں بھی پرواز کرنے لگا۔ اس تک پہنچا اور پہلو میں بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیا ہوا ——— پھر عجیب عالم دیکھا۔ میرے سر پر کھڑی مجھے تک رہی تھی۔ کانوں پر اعتبار نہ تھا۔ کہتی تھی، دیکھو! مجھ پر کیا بیتی۔ میرا رنگ کتنا زرد پڑ گیا ہے، نیبیائی جاتی رہی۔ آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئیں۔ کتنی تکالیف اٹھائی ہیں۔ لیکن عشق و عصمت کو تمہارے لیے محفوظ رکھا۔ کئی راتیں جاگتے گزار دیں۔ دن بیابانوں میں بھوک پیاس میں تمہارے پیچھے بھاگتے گزارے۔ ان کے ڈر سے، جانوروں کا ڈر، درندوں کا ڈر، یہ سب کچھ تمہاری بدگمانی کی وجہ سے ہوا۔ کیا اب بھی تمہیں میری وفا پر شبہ ہے۔ مجھے پہلے کی طرح اپنا بنالے۔ میں تمہاری باوفا پری چہر ہوں۔ تمہاری کنیز ہوں۔ میری وہی روح ہے۔ لیکن صورت بدل گئی ہے۔ میرا گناہ نہیں۔

مجھے افسوس ہوا کہ کوئی میرے بدن کو مل رہا ہے۔ ہوش میں آیا تو حقیقت معلوم ہوئی۔ ایک قوی ہیکل ترکمان میرے اعضا کو دبا رہا تھا۔ ایک عورت اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے سر پر قرمزی رنگ کا رومال لپیٹا ہوا تھا۔ گورا رنگ بادامی آنکھیں۔ اس نے ترکی میں پوچھا۔ "کیا کوئی چیز کھا سکو گے۔" میں نے ڈرتے ہوئے کہا "مجھے مار دو گے۔" کہنے لگا "نہیں۔ ترکمان نہیں ہوں۔ ڈرو نہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور بوسہ لیا۔ کچھ غذا کھائی تو جان میں جان آئی۔ پھر اپنی داستان ترکی میں سنائی۔ دونوں بے حد متاثر ہوئے۔ اس نے جیب سے تومان نکالے اور میرے سامنے ڈال دیئے اور کہا یہ تمہارا مال ہے وہی ہے جو ترکمن چھین لے گیا تھا۔ میں چوری کا مال نہیں لیتا۔ یہ سفید گھوڑا بھی اسی ترکمان کا ہے اور تمہیں ملے گا۔ سوار ہو جاؤ تاکہ شہر چلیں۔

میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ نے پری چہر کو دیکھا ہے؟"

"نہیں! میں نے صرف اسی ترکمان کو دیکھا ہے جس کے متعلق بتایا ہے بیابان میں بھاگا جا رہا تھا۔ یقین کیا کہ ڈاکہ مار کر آ رہا ہے چنانچہ تیر مار کر گرا لیا۔ یہ سکے اسی کے جیب سے نکلے ہیں۔ یہ گھوڑا بھی اسی کا ہے۔ گل بہار یہ میری عورت اس پر سوار ہوئی۔ عجیب اتفاق ہوا۔ ہمارا گھوڑا بہت تھکا ہوا تھا۔"

میرے سوال کے جواب میں کہا "میری کہانی بہت طویل ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔

"میں فضل علی خاں سپہ سالار کا نوکر ہوں نام جہانگیر ہے۔ گزشتہ سال استر آباد میں فوج کے ساتھ تھا۔ ایک رات ترکمانوں نے شب خون مارا اور چاروں طرف سے محاصرہ کرلیا۔ بہت سے سپاہی مارے گئے۔ آخر ہم نے ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ کمک کی امید نہ تھی۔ ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ لئے گئے۔ مجھے اور میرے ایک ساتھی کو سردار یعنی اس لڑکی کے باپ کے حوالے کردیا گیا جس نے مجھے گھوڑے کا مہتر بنا دیا۔ یہ گھوڑا ترکمانوں میں مشہور ہے کہتے ہیں ہزار تومان کا ہے۔ سردار اس کی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ سات دن مصیبت میں مبتلا تھا۔ خدا اس حاکم پر لعنت

کرے۔ ہمارے لیے کمک نہ بھیجی اور ان حیوانوں کے حوالے کر دیا۔

چند روز بعد تین سوار آئے اور میرے ساتھی کو لے کر چلے گئے۔ میں تنہا رہ گیا۔

میری غذا یہی لڑکی گل بہار لاتی تھی۔ اس کا دل کڑھتا تھا۔ میرے پاؤں میں زنجیر کے زخم پڑ گئے تھے۔ گل بہار مرہم پٹی کرتی تھی۔ جب باپ اور بھائی گھر میں نہ ہوتے میرے سامنے بیٹھ جاتی، تسلی دیتی۔ محبت کا اظہار کرتی اور ہمیشہ باپ کی دوسری بیوی عائشہ کے خلاف باتیں کرتی۔ سردار کو گل بہار بہت زیادہ عزیز تھی۔

ایک دن آئی اور میری گردن میں ہاتھ ڈال دیئے، کہنے لگی "تم کتنے اچھے ہو۔" میں نے پرے ہٹا دیا۔ روتی ہوئی چلی گئی اور دو دن تک میرے پاس نہ آئی۔ عائشہ کھانا لاتی تھی۔ جب پوچھتا گل بہار کہاں ہے گالیاں دینے لگتی۔ گل بہار کے لیے اس قدر اداس تھا کہ کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ تیسرے روز گل بہار آئی اور کہنے لگی "کھانا کیوں نہیں کھاتے؟"

کہا "تیری وجہ سے"

"تو اب آگئی ہوں"

"تو اب کھاتا ہوں۔"

پھر وہ میرے نزدیک آگئی مگر میں نے آہستہ سے ہٹا دیا۔ کہنے لگی "کیا مجھ سے محبت نہیں ہے؟" —— میں نے کہا کیوں نہیں۔ لیکن تو نامحرم ہے میں تجھے جہنم میں نہیں لے جانا چاہتا۔ اگر چاہتی ہے تو میں سردار سے تیرا رشتہ مانگوں۔"

"آخر ایک روز اس کے باپ سے درخواست کی۔ اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کے بیٹے نے بندوق اٹھائی اور چاہا کہ مار ڈالے مگر گل بہار نے بچا لیا۔"

اس موقع پر گل بہار نے اپنے بازو جہاں شیر کے گلے میں ڈال دیئے اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں بھی رونے لگا۔ جہاں شیر نے کہا "صبر کرو۔ امام رضا علیہ السلام سے مدد کی التجا کرو۔ تمہاری مشکلات دور ہوں گی۔"

باقی کہانی اس طرح تھی۔

"اگر گل بہار نہ ہوتی تو انہوں نے مجھے مار دیا ہوتا۔ گل بہار ان پر حکومت کرتی تھی، جو وہ کہتی سن لیتے۔ لیکن اس کے بعد اکیلی میرے پاس نہ آئی۔ عائشہ ہمیشہ ساتھ ہوتی۔ عائشہ سے چھپ کر کبھی کبھی اشارے کرتی۔ ایک دفعہ سردار کے بیٹے اللہ وردی نے مجھے مارنے کا ارادہ کیا اور حملہ آور ہوا۔ میری زور کی چیخ سن کر گل بہار مدد کو پہنچی۔ شمشیر کے زخم سے بے ہوش ہو گیا تھا، ایک مہینہ علاج ہوتا رہا۔ خدا کو منظور نہ تھا کہ مر جاؤں۔

کل رات سویا ہوا تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ خیال کیا کہ اللہ وردی پھر مارنے کے لئے آگیا ہے۔ مگر گل بہار تھی۔ آہستہ سے کہا "میں ہوں آؤ بھاگ چلیں"۔ میں نے کہا "میرے پاؤں زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں"۔ چابی سے تالا کھولا گیا اور میں آزاد ہو گیا نہ جانے کیا ہوا۔ شیطان نے ورغلایا بے اختیار گل بہار کے بوسے لینے لگا ——— گھوڑے کے سموں پر کپڑا باندھ لیا تاکہ آواز پیدا نہ ہو، چلتے چلتے صبح ایک چشمے کے کنارے پہنچے اور بیٹھ کر کھانا کھایا۔

ماشاء اللہ گل بہار نہایت ہوشیار عورت ہے اور اپنے ساتھ چاندی سونا اور نقدی لائی ہے۔ یہ اسی کا مال ہے جس طرح چاہے خرچ کرے۔"

گل بہار کی کہانی سن کر دل میں شکوک پیدا ہوئے۔ محض خواہشاتِ نفسانی کی خاطر ہر چیز کو

چھوڑ دیا ہے۔ باپ کو پریشان کیا ہے۔ پری چہر نے بھی اسی طرح کیا تھا اور میں اس جذبۂ محبت پر خوش تھا۔ لیکن جو لڑکی باپ کو ناراض کر کے گھر چھوڑتی ہے اور عاشق کے پاس چلی جاتی ہے، کیا وہ وفادار ہے اچانک فریدوں اور پری چہر کا واقعہ نظروں میں پھرنے لگا۔ جہاں شیر پر افسوس کرتا تھا۔

اسی فکر میں تھا کہ جہاں شیر نے کہا "میرا حال تجھ سے بہتر ہے، ہمیں نجات حاصل ہوئی ہے اور تم تازہ مصیبت میں گرفتار ہوئے ہو۔ خدا تمہیں صبر دے۔ انشاء اللہ تبریز پہنچ کر گل بہار سے شادی ہو جائیگی۔

یہ حکایت سن کر اپنے آپ کو بھول چکا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جہاں شیر نے کہا "آؤ چلیں وہ میرے تعاقب میں ہونگے۔"

میں نے کہا "پری چہر کو تلاش کرنا چاہتا ہوں میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔"

"لیکن اکیلے اس بیابان میں کیا کروگے، شہر چلو اس کے متعلق سوچیں گے۔"

جہاں شیر کے اصرار کا کچھ اثر نہ ہوا، آخر ترکمان والا گھوڑا مجھے دیدیا گیا۔ اس نے کہا اگر تہران میں کوئی پیغام بھیجنا ہے تو بتا دو۔ چاہا کہ بھائی کی دکان کا پتہ بتا دوں، مگر ڈرا کہ اس طرح فریدوں کو پتہ چل جائے گا اور وہ پری چہر کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ فریدوں کے پاس جانے کی بجائے پری چہر کا مرنا یا ترکمانوں کے پاس ہونا بہتر ہے۔

آخر جہاں شیر سے کہا کہ میں بوڑھی ماں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا اور اس کے سوا میرا کوئی نہیں۔ جہاں شیر نے تبریز کا پتا بتایا اور اس کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔

میری نگاہیں دور تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ فریدوں کو ملامت کر رہا تھا۔ اے دوست تو نے بُرا کیا، مجھے مار ڈالا —— کیا تو وہی نہیں جو بچپن میں اس قدر بہادر، شجاع اور جواں مرد تھا۔ یہ کیا انتقام لیا فساد کا بیج بویا۔ میری زندگی تباہ کر دی۔ میری طرح تیرے دن بھی تاریک راتوں میں تبدیل ہو جائیں۔

گھوڑا بید کی طرح لرز رہا تھا۔ میں تھپکی دیتا رہا۔ تم حیوان ہم سے زیادہ عقلمند ہو دوست دشمن کو پہچانتے ہو۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے، چاہا کہ فریاد کروں لیکن آواز نہ نکلی۔ چاہا کہ سوار ہو کر ان کے پیچھے چلا جاؤں مگر تاب نہ تھی۔ گھوڑے کے گرم گرم سانس کو اپنے قریب محسوس کیا۔ اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور پیار کیا۔ بیچارہ بیابان میں گھبرا رہا تھا۔ سوار ہوا اور چل پڑا۔ باگ ڈور گھوڑے کی مرضی پر چھوڑ دی مجھے معلوم نہ تھا کہاں لے جا رہا ہے۔

رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکو آ رہے ہیں۔ ڈر کی وجہ سے آنکھیں بند کر لیں۔ جونہی کھولیں، دور روشنی دکھائی دی، یقین تھا، آبادی کی روشنی ہے، اسی طرف بڑھنے لگا، مگر گھوڑا بدکنے لگا حتیٰ کہ رک گیا اور کانوں کو کھڑا کر لیا۔ میں سمجھ گیا کوئی درندہ ہے، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا، وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بہت دور جا کر آرام کیا۔ گھوڑا بید کی طرح لرز رہا تھا۔ میں تھپکی دیتا رہا، اے کاش میں بھی تمہاری طرح ایک جانور ہوتا فریدوں کو نہ جانتا۔ تم حیوان ہم سے عقل مند ہو، دوست دشمن کو پہچانتے ہو۔ کیا تمہاری بھی کوئی پری چہر ہے اور تم اس کے ہجر میں تڑپتے ہو، کاش میں تمہاری جگہ ہوتا۔"

صبح کی سفیدی روشن تھی، میں پری چہر کے خیالات میں گم تھا کہ اچانک ایک تیر میرے قریب آگرا۔ چند ترکمان میری طرف آرہے تھے، دل لرزا۔ خیال کیا تیر کھا کر سر جاتا بہتر ہوگا۔ یہ سوار میری خلاصی کے لیے آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے مجھے چابک اور لاتوں سے مارنا شروع کر دیا۔ التجا کرتا رہا، مجھے مار ڈالو اور نجات دلاؤ۔ ان میں سے ایک رحم دل تھا بڑا چھرا نکالا اور مارنے کا ارادہ کیا۔ دوسرے مانع ہوئے۔ بڑے ترکمان نے پوچھا تم کون ہو اور کیا کام کرتے ہو۔ میں نے تمام کہانی کہہ سنائی۔ جہاں شیر کے قصے تک پہنچا تو بوڑھے کے آنسو بہنے لگے، یہ گل بہار کا باپ تھا۔

انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں کس لیے اور گھوڑے پر بٹھا لیا۔ اس پیرِ مرد کے ساتھ ایک اس کا بیٹا اور دوسرا نوکر تھا۔ گل بہار کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے۔ میں کمزوری کی وجہ سے نیچے گر پڑا، انہوں نے مارنا شروع کر دیا جب ہوش میں آیا تو پیرمرد کو چھرا لیے کھڑا دیکھا۔ میں نے التجا کی مجھے مار کیوں نہیں دیتے۔ مار ڈالو مجھے مار ڈالو۔

وہ مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "میری عورت کو کون لے گیا اور کہاں لے گیا؟"

کہنے لگے" وہ ترکمان چند تھے، وہ عورت تجھے مرنے کے بعد ملے گی۔"

میں نے کہا" کیا اسے کسی طرح نجات مل سکتی ہے؟"

"ترکمان خوبصورت عورت کو واپس نہیں کرتے۔"

انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔

میں بے اختیار گالیاں دینے لگا چیخیں ماریں اور کہا "تمہاری بیٹی بھی اہلِ شیراز کے لیے خوب ہے۔"

یہ سُن کر پیرمرد جھکا اور کہا" اگر میری بیٹی تلاش کر دے تو تمہاری عورت بھی تمہیں مل جائے۔"

ناگاہ اُمید کا آفتاب روشن ہوا۔ کہا تو میری عورت لا، میں تمہاری گل بہار لاتا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ لہٰذا دوست بن گئے۔ اس نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ میں نے التجا کی کہ میری عورت کی تلاش کریں اور میں بھی لکھتا ہوں کہ گل بہار واپس پہنچا دیں۔ اس نے میرے ہاتھ کھول دیئے۔

راستے میں وہ گل بہار کی باتیں کرتا رہا۔ میں پری چہر کے خیال میں مست تھا۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا گل بہار کو کس تکلیف سے پالا۔ دل و جان سے پرورش کی ______ مگر گل بہار تُو نے بُوڑھے باپ سے دھوکا کیا، عائشہ اچھا کھانا نہیں پکا سکتی۔ میری بیٹی گل بہار" میری اور بوڑھے ترکمان کی دوستی گل بہار اور پری چہر کی وجہ سے تھی کہتا تھا۔ پاؤں اس لیے باندھے ہیں کہ بھاگ نہ جائے اور گل بہار کی واپسی کی امید نہ جاتی رہے۔ حیوان کا دل موم ہو گیا تھا۔ کہتا تھا میرا بیٹا اللہ وردی جہاں شیر اور گل بہار کے تعاقب میں گیا ہے۔ جب واپس آئے گا، تمہاری عورت کی تلاش کی جائے گی۔ اگر اسے گل بہار نہ ملی تو تمہیں لانا پڑے گی۔ میں ہر شرط قبول کرتا تھا۔ تین روز کے بعد اللہ وردی آیا۔ دو اونٹ اور مالِ غنیمت وغیرہ لایا۔ کسی کو لوٹ کر آیا تھا۔

ابھی وہ میرے محتاج تھے۔ ایک دن کہا" اللہ وردی جاؤ اور پری چہر ترکمانوں سے خرید لاؤ۔" پھر مجھے مخاطب ہو کر کہا اچھا تم بھی خط لکھو کہ گل بہار کو پہنچا دیں اور روپیہ بھیجیں تاکہ تمہاری عورت کو خریدا جائے۔

کاغذ لکھنے کے سوا چارہ نہ تھا اپنے چچا کے نام خط لکھا۔ وہ تبریز میں تجارت کرتا تھا۔ رات مشکل سے کٹی۔ دیکھتا تھا کہ گل بہار کو واپس لاتے ہیں وہ رو رہی ہے اور کہتی ہے، تم نے بھلائی کا حق خوب ادا کیا۔

جہاں شیر کے ساتھ کیا کیا۔ آفریں تم پر ــــــ میں شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ خیال کیا کسی بہانے کاغذ کو واپس لوں اور کسی جاہل کے نام لکھ دوں۔ لیکن پری چہر کی خلاصی کا خیال مجبور کرتا تھا کہ دنیا تباہ ہو جائے مگر میری کشتی ساحل مراد تک پہنچ جائے۔

عائشہ، اللہ وردی اور گل بہار کی سوتیلی ماں تھی اس کی کوئی اولاد نہ تھی عمر پچاس سال سے زائد، بدصورت سیاہ رنگ۔ جب بوڑھا ترکمان چلا جاتا تو میرے پاس آ بیٹھتی اور شوہر کی شکایت کرتی۔ کہتی گل بہار کی خاطر مار کھائی، مار کی وجہ سے ایک آنکھ کھو بیٹھی۔ عائشہ گل بہار کے جانے سے خوش تھی۔ وہ افسوس کرتی تھی کہ میں جہاں شیر کے ساتھ کیوں نہ چلا گیا۔ مجھے کہتی تھی، گل بہار کی واپسی سے متعلق خط نہ لکھنا۔ تمہاری عورت واپس نہیں ملے گی۔ مجھے لے کر بھاگ جاؤ۔"

جس رات کاغذ لکھا، پریشان تھا۔ وہ مجھے پر معنی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ دوسرے دن کاغذ ڈاک میں ڈالنے کے لیے نوکر کو بھیجا گیا اور اللہ وردی میری عورت کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

(۶)

بوڑھا ترکمان اپنے کام پر چلا گیا۔ میں تنہا تھا عائشہ کی مصاحبت بھلی لگتی تھی۔ خلاف معمول بہت شوق سے انتظار کرتا رہا کہ آئے اور کچھ کہے۔ کبھی ادھر جاتی کبھی ادھر، میں سمجھ گیا کہ گل بہار کی واپسی سے متعلق جدوجہد کی وجہ سے پریشان ہے۔ جب آواز دی تو گالیاں دینے لگی۔ میں نے منت سماجت کی اور کہا۔ آؤ بھاگ چلیں۔ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا میرے نزدیک آئی۔ ہاتھ پکڑا اور بوسہ لیا، اصرار کرتی تھی کہ اسی رات بھاگ چلیں۔ اس نے جیب سے وہی کاغذ نکالا جو ایک روز پہلے تبریز لکھا گیا تھا۔ میں بہت حیران تھا کہنے لگی "کیا تو خیال کرتا ہے گل بہار کو واپس آنے دوں گی۔ آج صبح نوکر کی غور جیب سے کاغذ نکال لیا۔ وہ خیال کرتا ہے کہیں گم کر بیٹھا ہے لیکن ڈر کی وجہ سے بتانے کی جرأت نہیں کرتا۔ جان لے اگر گل بہار واپس آجاتی، تمہیں اور ان دونوں کو ہلاک کر دیتی۔

اب تو عائشہ فرشتہ معلوم ہوتی تھی بے اختیار بازوؤں میں لے لیا ــــــ کاغذ کو پھاڑ دیا۔ عائشہ بھاگنے پر اصرار کرتی تھی۔ کہتی تھی عورت کا خیال چھوڑ دے۔ محض کاغذ لکھوانے کے لیے دھوکا کیا گیا ہے ــــــ اللہ وردی خچروں کو فروخت کرنے گیا ہے آج ہی واپس آجائے گا۔

مجھے یقین تھا کہ عائشہ بھاگنے کی خاطر جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے بھاگنے کی مشکلات سے آگاہ کیا۔ وہ بہت پریشان ہوئی۔ پہلو سے اٹھی اور کام کاج میں لگ گئی۔

ڈرتا تھا اللہ وردی ابھی لوٹ آئے اور اس کا کہنا صحیح نہ ہو ــــــ مگر وہ نہ لوٹا۔

گل بہار کے باپ سے باتیں ہوتی رہیں۔ کہتا تھا "پرسوں تک گل بہار آجائے گی۔ میں بھی چچا کے ذرائع کے قصے بنا بنا کر پیش کرتا رہا۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔

میں نے کہا "میری عورت لوٹا دے جو چاہے دوں گا۔" اس نے کہا میں کیا جانوں تمہاری عورت کیا جہنم ہے۔

عائشہ سچ کہتی تھی اس خیانت سے اس قدر پریشان ہوا کہ ہوش و حواس جاتے رہے پھر خیال آیا کہ میں نے بھی تو خیانت کی ہے۔

فرار کے سوا چارہ نہ تھا۔

دوسرے دن اللہ وردی آیا مگر تنہا۔ جب میں

سے پوچھا کچھ پری چہر کی خبر لائے تو مذاق کرنے لگا اور کہا "تمہاری بیوی خورجین میں ہے میں ابھی باہر نکالتا ہوں۔"

ایسی باتیں سن کر میں غصے میں بے اختیار ہو گیا اور اسے گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ چھری سے مارنے والا تھا کہ اس کا باپ اور عائشہ آ گئے اور اسے چھڑا لیا۔ اللہ وردی درندوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ میں نے اس دن ایک وحشی انسان کو دیکھا وہ منظر کبھی نہیں بھولوں گا۔

بوڑھا ترکمان کہتا تھا "عجیب احمق ہو۔ گل بہار کے آنے تک تو ہمارا مہمان ہے۔ تین ہزار تومان دے کر نجات ملے گی۔ ورنہ سر کی خیر نہیں۔ پھر گالیاں دیتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ گردن میں ایک مضبوط رسی ڈال دی۔ اب ایک ہی راستہ تھا یعنی عائشہ کے ساتھ فرار۔ لیکن عائشہ کا وجود بھی قید سے کم نہ تھا۔ اس کو لے کر کہاں جاتا اور کیا کرتا۔ خیال آیا اسے بیابان میں چھوڑ دوں اور تنہا بھاگ جاؤں لیکن اس بدی سے متنفر ہو گیا۔

انہی خیالات میں رات کٹی۔ اللہ وردی بھی محو خواب تھا۔ بوڑھا ترکمان اٹھا اور باہر چلا گیا۔ میری نگاہیں عائشہ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ کام کاج میں مشغول تھی۔ میں نے قریب آنے کا اشارہ کیا مگر اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ پھر اشارہ کیا اور کہا تیرے ساتھ ایک کام ہے۔

اس نے بلند آواز میں فحش گالی دی۔ اس کی آواز سُن کر اللہ وردی بھی اٹھ بیٹھا اور مجھے ایسی لات ماری کہ جان نکل گئی۔

حالات سے مجبور ہو کر عائشہ کے ساتھ بھاگنے کا ارادہ کر لیا، اور ایک عاشق زار کی طرح اس کی ہر حرکت پر نگاہ ڈالتا تھا۔ وہ مجھے حاجت مند سمجھ کر بے اعتنائی سے کام لے رہی تھی اور گالی کے سوا کوئی جواب نہ دیتی تھی۔

دوپہر کے وقت عائشہ نے روٹی کے ٹکڑے پھینکے۔ میں نے التجا کی "خدا کے لیے میرے ہاتھ کھولو۔" مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ کمرے میں چلی گئی اور اللہ وردی سے کہا "جاؤ ہاتھ کھولو۔" اس نے کہا "خود کھول دو۔ مجھے آرام کرنے دو۔" کہنے لگی "میں جانتی ہوں تم اس لیے نہیں جاتے کہ آزاد ہو کر کل کی طرح زمین پر نہ دے مارے۔ غیرت جوش میں آئی اور مجھے اور عائشہ کو گالیاں دینے لگا۔ پھر کمرے سے باہر نکلا۔ میں نے غضب آلود نگاہ ڈالی اور کہا "ذرا کھول تمہاری باتوں کا جواب دوں۔ وہ واپس چلا گیا اور عائشہ سے کہا۔ اگر میں اس کتے کے نزدیک گیا تو جان سے مار دوں گا۔" عائشہ ہنسنے لگی اور کہا "ڈرتے ہو، ڈرتے ہو"

اللہ وردی نے اسے تھپڑ مارا وہ چلائی اور روتی ہوئی میرے پاس آئی۔ آزاد ہو کر، میں نے اس کا بوسہ لیا۔ منع نہ کیا۔ دوبارہ بوسہ لیا، خاموش رہی۔ میں نے آہستہ سے کہا جب چاہو بھاگ چلیں۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چلی گئی۔ میں یاس و امید کے درمیان گھرا ہوا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ عائشہ کا انتظار کر رہا تھا کہ کب کمرے سے باہر نکلتی ہے۔ گردن کی رسی گھس گھس کر نرم ہو گئی۔ توڑنے میں آسانی ہو گئی۔ پاؤں کی زنجیر کا توڑنا مشکل کام تھا۔ ناگہاں معلوم ہوا کہ میرے پاؤں پر کسی کا ہاتھ ہے عائشہ تھی، منہ پر انگلی رکھ دی۔ مطلب تھا کہ خاموش رہوں۔ تالا کھولا اور زنجیر ہٹا دی میں اٹھا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔ چلتے چلتے آبادی سے دور پہنچ گئے۔ ایک گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ جلدی جلدی سوار ہوا۔ عائشہ کو پیچھے بٹھایا اور گھوڑے کو دوڑا دیا۔

کچھ معلوم نہ تھا کہاں جائیں۔ صبح ہونے والی تھی۔ آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ پیچھے سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا چند آدمی گھوڑوں پر سوار تعاقب

میں آ رہے ہیں۔ گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ اتنے میں بندوق کے چلنے کی آواز آئی۔ ایک دستہ سواروں کا سامنے سے نظر آیا۔ گھوڑے کو تیز کیا کہ ان سے جا ملوں۔ پنڈلی پر سخت چوٹ آئی۔ رفتہ رفتہ گھوڑا بھی تھک گیا اور گر پڑا۔ چند قدم دوڑا مگر وہ آپہنچے۔ دیکھا کہ اللہ وردی کی تلوار روشنی میں چمکی اور میری پیشانی پر آئی۔ پھر کچھ نظر نہ آیا۔

(۷)

جب ہوش میں آیا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل مرد پگڑی باندھے میرے پاس بیٹھا تھا اور مرہم پٹی کر رہا ہے۔ پیشانی کا زخم باندھ چکا تھا۔ میں تعجب میں درد کو بھول گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اللہ وردی اور سردار عثمان غائب تھے۔ وہ مرد شہری وضع کا تھا۔ سفید پوست اگرچہ دھوپ کی وجہ سے رنگ گندمی ہوگیا تھا۔

"تم کون ہو؟ اور یہ جگہ کونسی ہے؟"

وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اس کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ قدرے تامل کے بعد بولا "ڈرو نہیں! ترکمان نہیں ہوں۔ بخارا کا تاجر ہوں۔ میرا نام سرفراز خاں ہے" بولو نہیں علاج معالجے میں دقت ہوگی۔ کچھ کہنے کو تھا کہ انگلی سے اشارہ کیا یعنی میں خاموش رہوں۔

سرفراز خاں اسی میرے کمرے میں سوتا تھا۔ رات کو اٹھتا اور میرے دل کی دھڑکن معلوم کرتا۔ دن کو باہر چلا جاتا۔ ایک ترکمان کو میری تیمارداری کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ترکمان میری باتوں کا جواب نہ دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا خان نے کہا ہے بولنا نہیں۔

بخارا کا تاجر اکثر پڑھنے میں معروف رہتا۔ ایک دفعہ لکھتے دیکھا۔ مگر بائیں سے دائیں لکھ رہا تھا۔ تعجب ہوا۔ وہ اکثر ننگے سر رہتا تھا۔ لہجہ بھی فرنگی تھا۔ بالکل فرنگی معلوم ہوتا تھا۔

مجھے یقین ہوگیا کہ وہ یورپین ہے۔ اچھا ہوا میری نجات اسی میں تھی۔ ایک صبح ارادہ کیا کہ سرفراز سے اپنی داستان کہوں کہ ایک لاغر مرد داخل ہوا۔ ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ مجھے دیکھ کر تعجب کیا۔ سرفراز نے

> اس کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بولا "ڈرو نہیں۔ مگر ترکمان نہیں، بخارا کا تاجر ہوں۔ بولو نہیں"

انگریزی میں کہا "فکر نہ کرو" میں نے چاہا کہ انگریزی میں کچھ کہوں مگر جرأت نہ ہوئی۔ سرفراز نے اس سے پوچھا "دو تین روز دیر کیوں کر دی؟"

دوسرا یورپین نہ تھا۔ اس نے کہا "کام سخت مشکل تھا"

اسی طرح رازدارانہ باتیں ہوتی رہیں۔ اگرچہ میں پوری طرح نہ سمجھ سکا مگر معلوم ہوگیا کہ وہ تاجر نہیں بلکہ سیاسی آدمی ہے۔ میرے متعلق اسے بتایا کہ واپس آتے ہوئے چند ترکمان اس کے تعاقب میں تھے۔ انہوں نے بری طرح زخمی کیا۔ کہتے تھے ڈاکوؤں میں سے ہے لوٹ مار کرتا ہے۔ اب گھوڑا چرا کر بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے انہیں سو تومان دیئے تاکہ میرے حوالے کردیں۔ وہ ہزار مانگتے تھے۔ آخر طے پایا کہ علاج کے بعد لوٹا دوں گا۔ وہ ترکمان یہیں ہیں تاکہ صحتیاب ہونے پر واپس لے جائیں۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور انگریزی میں کہا "خدا کے لیے ان ظالموں سے نجات دلایئے۔ مجھے ان درندوں کے حوالے نہ کریں۔ میں دیہاتی نہیں ہوں۔ آپ کی طرح شہری ہوں۔ ان ظالموں کے ہاتھ گرفتار ہوں۔ اگر

آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کس قدر مصیبت زدہ ہوں تو آپ آزاد کر دیں گے۔"

میری بات سن کر متعجب ہوئے۔ سرفراز نے کہا "جو کچھ ہم نے کہا ہے تم نے سن لیا ہوگا۔"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

دوسرے آدمی نے کہا "اس نے ہماری تمام باتیں سن لی ہیں زندہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔"

سرفراز نے کہا "کوئی حرج نہیں۔ غفلت ہم سے ہوئی اس کا کیا قصور ہے۔"

میں نے دست بستہ التجا کی "مجھے امان دیجیئے تاکہ اپنی عورت کو ان وحشیوں کے پنجے سے نجات دلاؤں۔ قسم کھا کر کہتا ہوں جب تک زندہ ہوں کوئی حرف بھی ظاہر نہ کروں گا۔" اس کے بعد غش آ گیا۔

جب ہوش میں آیا سرفراز کو بالیں پر بیٹھے ہوئے دیکھا کہنے لگے "تمہاری عورت کہاں اسیر ہے؟ تم کون ہو؟"

میں نے اپنی کہانی کہہ سنائی۔ ایک لمحہ میری طرف دیکھا اور کہا "تمہاری قسم پر اعتماد ہے کہ کسی بات کو افشا نہ کرو گے لیکن پہلے کیوں نہ بتا دیا کہ انگریزی جانتے ہو۔"

چاہا کہ جواب دوں مگر فرصت نہ دی اور باہر چلا گیا۔ پھر جلدی ہی واپس آ گیا اور کہا "دو ترکمانوں کو جو تمہیں لینے کے لیے آئے تھے ہزار تومان دے کر بھیج دیا ہے۔ تمہاری عورت کی تلاش کی جائے گی۔"

پھر اپنے ملازمین میں سے دو ترکمانوں کو بلایا اور کہا کہ انہیں تمام حالات سے آگاہ کروں اور پری چہر کی کوئی نشانی بتاؤں۔ جو کچھ ضروری تھا انہیں بتا دیا اور اس مضمون کا خط لکھا۔

"پری چہر،

کتنا سخت جان ہوں ابھی تک زندہ ہوں جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب تمہاری پرستش کے لیے پاک و صاف ہوں۔ تمہارے سوا کسی چیز کی تمنا نہیں۔ تمہارے وصال کے شکرانے میں جو مصائب اٹھائے ہیں دنیا کو بخشتا ہوں۔ تم پر کیا بیتی ہے میں کبھی تیرے خیال سے فارغ نہیں رہا۔ تمہارے پاؤں میں کوئی کانٹا نہ چبھا ہوگا کہ میرے دل سے نہ گزرا ہو۔ ہر رات کا زرد رنگ چاند تمہاری داستان کہتا ہے۔ تمہارے آنسوؤں کے قطروں کا شمار ستاروں سے کرتا ہوں۔ جاں سوز نالے نسیم صبح سے سنتا ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا نئی نئی شادی ہوئی تھی، فصلِ بہار جوبن پر تھی۔ صحرا میں سیر کر رہے تھے، پہاڑ کا نظارہ کتنا دلفریب تھا۔ پہاڑ کو بڑھاپے سے تشبیہ دی تھی کہ سر سفید ہے، اگر سبز قبا زیبِ تن ہے۔ وہ کہہ رہا تھا آ دیے دامن میں عشق بازی کر دو۔ ——— پھر کچھ تمہیں یاد ہو گا۔ تم نے چادر کو سر سے ہٹا دیا تھا اور چمٹ گئی تھی۔ تھوڑی دور جا کر پھر ٹھہر گئے۔ تم نے اپنے ہاتھ سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ———

"اے بوڑھے پہاڑ! گواہ رہنا۔ میں نے جان و دل علی جان کو دے دیئے ہیں۔ اب کوئی لے نہیں سکتا۔"

——— میں دور چلا گیا کہ تماشہ دیکھوں۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے تمہاری سیاہ زلفوں میں کنگھی کر رہے تھے۔ چہرہ آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ ہوا کی وجہ سے تمہارا لباس بدن سے چمٹا ہوا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ بتاؤ اس وقت کیسے لگ رہی تھی۔ بالکل فرشتہ کی مانند جو آسمان سے گر پڑا ہو ——— کہتی تھی یہ پہاڑ عجیب بوڑھے مرد کی طرح ہے کہ ہمارا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ کیا بتاؤں یادِ ماضی عذاب ہے۔

میں اب خط لکھ رہا ہوں۔ ایک باوقار مرد کے سامنے بیٹھا ہوں جو ہمارے عشق سے محبت کرتا ہے، لیکن کچھ نہیں کہتا ہمارا نجات دینے والا ہے۔ تفصیل ملاقات کے بعد کہوں گا۔

پاؤں پر گولی لگی ہے۔ پیشانی زخمی ہے، ورنہ خود آتا۔ حاملین رقعہ تمہیں نجات دلائیں گے۔ فرقت کی طویل رات ختم ہوئی۔ آؤ کہ باقی عمر عید منائیں۔"

تیرا پرستار :- علی

پُرامید دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اچانک گزشتہ یادوں نے ستایا۔ تاریک خیالات نے حملہ کیا۔ فریدوں کے ڈرائنگ روم کا منظر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

اِس کے باوجود پری چہر کی آمد کی خوشی تھی۔ زخم مندمل ہو رہے تھے، غسلِ صحت کیا، نیا لباس پہنا، آئینہ دیکھا۔ زخم کی وجہ سے دائیں آنکھ بیٹھ گئی تھی۔ خیال کیا یہ زخم پری چہر کی نظروں میں مجھے پہلے سے زیادہ محبوب بنا دے گا، خوش تھا۔ زخم کے کھرنڈ کو نہ چھیلا تاکہ پری چہر بھی دیکھ سکے۔

دس روز گزر گئے۔ کوئی خبر نہ ملی —— پریشانی روز بروز بڑھتی گئی۔ ایک دو دفعہ سرفراز خاں سے اِس موضوع پر گفتگو ہوئی کہتا تھا: "گھبراؤ نہیں، میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ خدا بہتر کرے گا"، لیکن یہ تعیمت میرے لیے کافی نہ تھی۔ اُس کی خاموشی پریشان کن تھی۔

پندرھویں دن ترکمان آئے، لیکن پری چہر ساتھ نہ تھی کہنے لگے۔

"پری چہر کئی بار خرید و فروخت ہوئی۔ اب اُس کی قیمت سو بھیڑوں اور دو گھوڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ آخری دفعہ سردار عثمان کے پاس تھی۔ ترکمانوں کا سردار قلیچ خاں اپنے خوبرو بیٹے سمرخان کے ساتھ پشم کی تجارت کے لیے ترکستان سے یہاں آیا اور پری چہر کا خواستگار ہوا۔ پندرہ سو تومان پیش کئے، مگر سردار عثمان راضی نہ ہؤا۔ باپ بیٹا ایک مہینہ عثمان کے مہمان رہے رقم پری چہر تک پہنچا دیا تھا۔ ان خریداروں کی روانگی کا انتظار کرتے رہے تاکہ معاملہ طے کریں۔ ایک رات باپ بیٹا دونوں پری چہر کو لے کر رُوسی سرحد پر چلے گئے"۔

کاٹو تو بدن میں لہو نہیں بے حس و حرکت مجسمے کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

سرفراز خاں نے رحم کھایا اور مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "روس میں بردہ فروشی ممنوع ہے نگرانی کی ضرورت نہیں۔ تمہاری بیوی آزاد ہو کر ایران پہنچ جائے گی۔ میں تجھے حفاظت سے تہران پہنچا دیتا ہوں۔

میں نے ہاتھ پکڑا اور بوسہ لیا۔

سواروں نے دوبارہ پری چہر کا احوال پوچھا، مگر مایوس ہؤا۔ سرفراز نے مداخلت کی۔ آخر طے پایا کہ اگلی صبح تہران روانہ ہوں

تمام رات خوابوں کے محل تعمیر کرتا رہا۔ کبھی شوقِ وصال سے بے چین، کبھی حسد اور غیرت کے جذبات کا ہجوم سیاہ.... پری چہر کو الوداع کہا کہ روس بھاگنے پر رضامند ہو گئی، لیکن وہ نوجوان کے ساتھ کیوں چلی گئی۔ حیران تھا کہ خط ملنے کے باوجود کیوں انتظار نہ کیا۔ اس کی بے گناہی کے دلائل پیدا کرتا کہ ناچار بھاگی ہے، کیونکہ وہاں سے تہران پہنچنا آسان ہو گا، لیکن ان خیالات کے باوجود یہ تصور کہ پری چہر ایک خوبرو نوجوان کے ساتھ گئی ہے، پریشان کرتا تھا۔

سرفراز خاں سے درخواست کی کہ روسی سرحد تک اُن کے تعاقب میں جانا چاہیے۔ اگر مصیبت میں گرفتار ہو تو اس کی نجات کا بندوبست کیا جائے اور اگر تہران چلی گئی ہو تو وہاں سے راستہ آسان ہے۔ غور و فکر کے بعد جواب دیا کہ میرا بھی روس جانے کا ارادہ ہے، اکٹھے چلیں گے۔

تین روز بعد سرفراز خاں اور اُس کے ساتھی علی قلی کے ساتھ روس روانہ ہؤا۔ تجارت کا مال ساتھ تھا۔ سرحد تک تقریباً بیس میل کا سفر تھا۔ ترکستان پہنچ کر علی قلی نے سرحد کے پہرہ داروں کو ایک کاغذ دکھایا اور ہم بخیریت پار چلے گئے۔

ہمیں پتا چلا کہ سردار قلیچ خاں کی منزل چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ سرفراز خاں اور علی قلی آپس میں باتیں کرنے لگے کہ سردار قلیچ خاں اِس علاقے کے رُؤسا میں سے ہے۔ میں متوجہ ہُوا اور بے تابی میں پوچھا کیا پری چہر کے متعلق بھی کوئی خبر ملی ہے؟

دونوں نے آنکھیں جھکا لیں اور خاموش ہو گئے۔ میں نے سوال دہرایا۔ سرفراز خاں کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے کہنے لگا "کاش میں تیری جگہ ہوتا۔ میں کئی سال تک ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا رہا۔ آخر مقصد کو پہنچا۔ منگنی ہوئی، شادی سے

ایک ہفتہ پہلے وہ بیمار ہوئی اور مر گئی۔ اُس روز سے ہر خوشی کو ترک کیا اور تیس سال اِسی مصیبت میں گزار دیئے۔ میں تیس سال سے مر چکا ہوں۔ یہ حادثہ ناگوار ہے یا یہ کہ تمہاری بیوی نے بیوفائی کی اور کسی اور سے شادی کر لی۔ بہتر تھا اس کا خیال دل سے نکال دیتے۔

باقی الفاظ نہ سن سکا، سر چکرا گیا، دنیا گھومتی نظر آئی۔ سرفراز خاں اور علی قلی مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلے گئے۔

تنہائی میں زار زار روتا رہا جب سرفراز لوٹا تو عرض کی، آقا! یقین کیجئے میری بیوی وفادار ہے کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ یہ خبر صحیح نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت برعکس ہے۔ گمان ہے کہ فرار کی خاطر جھوٹا وعدہ کیا ہو!"

"خدا کرے ایسا ہی ہو!" سرفراز خان نے جواب دیا

میں نے کہا "پری چہر کو کل یہاں لاؤں گا تاکہ آپ کا شکریہ ادا کرے۔ اس کے بعد ایران جائیں گے!"

تمام رات ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔ پری چہر کو فریدوں کی آغوش میں یا جوان ترکمان کے بستر پہ دیکھتا، دیوانہ وار اٹھ بیٹھتا اور ارادہ کرتا کہ سرفراز کو مار ڈالوں۔ اُس نے مجھے موت کے منہ سے کیوں بچا لیا۔ پھر اس شہر کو آگ لگا دوں۔ پری چہر کو جلتا دیکھوں، اس کی چیخیں سنوں اور میں خوشی مناؤں، قہقہہ لگاؤں، ناچوں ارادہ کرتا کہ شہر جاؤں اور قلیچ خاں کے بیٹے عمر خان کو پارہ پارہ کر دوں، مگر اعصاب جواب دے چکے تھے۔

بہت رویا اور محسوس کیا کہ پری چہر میرے پہلو میں لیٹی ہے آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہے اور کہتی ہے "علی جان! کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرے متعلق بدگمانی کی۔ تمہارا دل خانۂ عشق ہے بدگمانی کو جگہ کیوں دی۔ ایک دفعہ دیکھ لیا بدگمانی کا کیا نتیجہ نکلا۔ میں تمہاری خاطر فریدون کے گھر گئی، تاکہ دوستانہ تعلقات منقطع نہ ہوں۔ اب جو ترکمانوں کے گھر میں ہوں، اِسی فداکاری کیلئے ہوں کہ راہِ فرار اختیار کر دں۔ کیا تم بھول گئے میں نے تمہارے لئے ماں باپ کو چھوڑا۔ پرویز جیسا اچھا شوہر تمہاری خاطر قبول نہ کیا۔

اِن حالات میں روا نہیں کہ میری وفا اور صداقت پر شک کرو۔

تم کیا خیال کرتے ہو؟ میں فریدون کو نہیں چاہتی تھی اور اب ترکمان وحشی کو کیسے ترجیح دے سکتی ہوں۔ عشق کا اعتماد سے زندہ ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے دوست نہیں رکھتے۔

میں جواب میں کہتا تھا۔

"میری پیاری پری چہر! مجھ سے غلطی ہوئی۔ میری حالتِ زار کو دیکھ، مجھ پر رحم کر۔ پھر ایسا نہیں ہوگا، مجھے معاف کر دے!"

انہی خیالات میں بیدار ہُوا۔ سرفراز خاں سے اجازت لی کہ علی قلی مجھے قلیچ خاں کے مکان تک چھوڑ آئے۔

راستے میں عجیب خیالات میرے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ پاؤں آگے نہیں بڑھتے تھے۔ ڈرتا تھا حقیقت پہلے سے بھی زیادہ خطرناک نہ ہو۔

سردار قلیچ خاں کا مکان گاؤں کے ایک کونے میں واقع تھا۔ سامنے صحرا تھا۔ میری حالت ایک ایسے آدمی کی سی تھی جو سردی سے لرز رہا ہو۔ دانت بج رہے تھے۔ اُمید کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ زندگی سراسر بدبختی اور حرمان نصیبی تھی۔ خنجر ہاتھ میں لیا۔ پیٹ میں سوزش محسوس ہوئی۔ ایسا معلوم ہُوا کہ پری چہر کو کسی نے مجھ سے چھین لیا ہے۔

تقریباً پچاس قدم کا فاصلہ تھا۔ چند شکاری کتے دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے پیچھے ایک سوار تھا —— پری چہر تھی۔ اُس کے سفید چہرے نے فضا کو روشن کر دیا۔ سر سفید حریر میں لپٹا ہُوا۔ چُست ریشمی لباس زیب تن۔ لمبی لمبی زُلفیں سانپوں کی طرح سینے پر بل کھا رہی تھیں۔ زرد وزری جوتا پاؤں میں تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور سوار تھا۔ اس کا گھوڑا پری چہر کے گھوڑے قامت میں چھوٹا تھا، مگر اپنے بلند قد کی وجہ سے اُس کے برابر لگ رہا تھا۔ وہ جوان مرد ترکمان معلوم ہوتا تھا۔

پری چہر زیبائش کی دلدادہ تھی۔ بے شرمی سے گردن اکڑائے سینہ اُبھارے چلی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے ہر طرف تیر برس رہے تھے۔ کتنی بے حیا تھی۔ دل چاہتا تھا اُس کی بوٹی بوٹی ہو سکتے

کے منہ میں ہے اور اِس طرح وہ جان دیدے۔

وہ کتوں کو ان کے ناموں سے پکارتی اور ہوا میں چابک گھماتی تھی۔ کتے میرے قریب سے گزرے۔ گامن بھی اُن میں شامل تھا۔ میں نے صدا دی۔ گامن مجھے خیرہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ دو مرتبہ اس کا نام لیا اب پہچان لیا اور دیوانہ وار میرے پاؤں پر گر پڑا۔ دِل کو تسکین ہوئی گویا کھویا ہوا خزانہ مل گیا۔ خیال کیا انسان کتے سے کمتر نہیں ہے۔

دوسرے کتے بھی میرے گرد جمع ہو گئے۔ پرپچہر اور عمر خان میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں چلّایا" پرپچہر میں علی ہوں، اترو، ڈرو نہیں!

پرپچہر نے تعجب سے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر ایڑی لگائی اور گھوڑا دوڑا دیا۔ عمر خاں قدرے ٹھہرا اور مجھے غلیظ نگاہوں سے دیکھتا رہا، لیکن پرپچہر کی آواز پر اُس کے پیچھے چلا گیا۔

دماغ چکرا گیا۔ حواس باختہ ہوئے، بیہوشی میں گر پڑا۔ علی قلی مجھے ہوش میں لایا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہاں ہوں اور کہاں جا رہے ہیں۔ یہ منظر آنکھوں کے سامنے لاتا تھا اور تعجب کرتا تھا۔ گویا یہ واقعہ کسی اور پر گزرا تھا اور میں تماشائی تھا۔ مختلف مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ گامن میرے پہلو میں تھا، لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی، اسی حالت میں گھر پہنچے۔ سرفراز خاں کی نگاہیں صاف کہہ رہی تھیں۔ دیکھا شک کرتے تھے، وہی ہوا جو میں کہتا تھا۔

چاہتا تھا کہ پرپچہر کے حق میں کچھ کہوں کہ میری معشوق سے بیوفائی محال ہے، لیکن زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ سرفراز خاں دُور چلا گیا۔

(٨)

تین روز تک بیہوشی حالت میں پڑا رہا اور ہذیان بکتا رہا۔ جب ہوش میں آیا۔ یادِ ماضی نے ستانا شروع کیا رونے لگا۔ جو کچھ دیکھا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تھا۔ فریدوں کے ساتھ تعلقات —— گزرے ہوئے دن —— اس روز فریدوں کے ہاں۔ میں لیٹا ہوا تھا اور گامن جیسے کہ مجھے تسلی دے رہا ہو۔ آہستہ آہستہ مجھے میرے کان پر لگا رہا تھا۔ گویا کہتا تھا میں پرپچہر سے بہتر ہوں، وفادار ہوں۔ پیمانِ وفا نہیں توڑتا ہوں اگر میرا آقا بدصورت ہو گیا تو بیزار نہیں ہوں۔ دوسرا چاہے کتنا خوبصورت ہو ترجیح نہیں

"لیکن میں اُس سے زیادہ چالاک ہوں۔ دو تین روز میں بھاگ آؤں گی اور ایران جاؤں گی"

دوں گا۔ میں کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔ پریشان نہ ہو۔

کتے کو بغل میں لیا، پیار کیا۔ گامن نے حقِ وفا ادا کیا اور میرے ساتھ چلا آیا، لیکن پرپچہر عمر خاں کے ساتھ چلی گئی۔ آہ! یہ انسان کتنا بیوفا ہے۔

گامن کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ وقت یاد آیا جب گامن کو مردہ ماں کے پستان سے اٹھایا تھا۔ اُسے سخت سردی میں دودھ پلایا تھا —— گامن نے وہ وقت یاد رکھا۔

ایک دن بعد سرفراز خاں نے میرے ہاتھ میں ایک خط دیا۔ پرپچہر کا خط تھا۔ کھولنے سے پیشتر خیال میں اُس کے بازو اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ گناہوں سے توبہ کی۔ لکھا تھا۔

"علی عزیز!

کہنے کی طاقت نہیں کہ تمہاری دید سے میری کیا حالت ہوئی خدا کا شکر ہے کہ ہر دو صحیح و سالم ہیں۔ تمہاری آنکھیں ایسی کیوں ہیں! یہ لمبی داڑھی کیسی؟ کیا تم بھول گئے ہو کہ مجھے ایسی چیزیں اچھی نہیں لگتیں۔ تجھے آفریں نہیں کہتے کہ کتنی ہوشیاری سے کام لیا، لیکن تمہیں ملیح خاں کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اُس نے تجھے موت کے پنجے سے چھڑایا اور اپنے خیال میں مجھے اپنے بیٹے عمر خاں کی منگیتر بنایا لیکن میں اُس سے زیادہ چالاک ہوں۔ دو تین روز میں بھاگ آؤں گی اور ایران جاؤں گی۔ تمہارا یہاں نزدیک رہنا خطرے سے

خالی نہیں، کیونکہ یہ جوان میرا دلدادہ عاشق ہے اور اُسے پتا چل چکا ہے کہ تم کون ہو اور کیوں آئے ہو۔ جلدی چلے جاؤ۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ پری پیکر کی خاطر فوراً چلے جاؤ اور تہران پہنچو۔ تمہاری موجودگی مانع ہو گی۔ فرقت کی داستان تمہاری آغوش میں بیان کروں گی۔ خدایا! اگر یہ ظالم میرے علی کو مار دیں، میری جان اُسی وقت لے لے۔

علی جان جلدی کرنا چاہیئے۔ روانگی سے مطلع کرو اور اس بوڑھے حامل رقعہ کے ہاتھ پیغام بھیجو۔ یہ میرا ہمراز ہے۔"

ہجر کی ماری،

پری پیکر

یہ عبارت میرے لئے مشعل تھی جو پری پیکر کی سیاہ روح کو روشن کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مجھ سے اپنے آپ کو آزاد کرے۔ اس درجہ بے رحمی اور خود پرستی کا کبھی خیال نہ کیا تھا۔

سرفراز خاں سے کہا "پری پیکر وحشیوں کے پنجے میں ہے۔ عمر خاں کی منگیتر ہے۔ ابھی اُن سے ڈرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُسے فوراً نجات دلائی جائے ——— تدرے سوچنے کے بعد کہا "بہتر ہے تم ایران چلے جاؤ۔ تمہاری عورت بھی اگر چاہے تو وہاں پہنچ سکتی ہے۔"

تلخ حقیقت دیکھ کر یہ جواب لکھا۔

"پری پیکر! میں بیچارہ ہوں۔ فریدوں کے بارے میں تمہارا رویہ دیکھ کر کہ تم مجھے کمزور اور بزدل خیال کرتی ہے اور ترکمانوں کی بندوقوں سے ڈراتی ہے۔ لیکن اِس بار مردانگی کے جوہر دکھاؤں گا اور تیرا شک دُور ہو جائے گا۔ جب تک یہ دھبہ دامنِ شرافت سے نہ دھوؤں گا۔ دنیا سے رخصت نہ ہوں گا۔"

علی

یہ خط لکھ کر تشویش سے نجات حاصل کی۔ یقین تھا کہ پری پیکر اس نوجوان سے خوش ہے اور میرے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ ارادہ کیا کہ اس کے محبوب کو مار دوں تاکہ اس کا دل جلے۔ یہ کینہ اور دشمنی کا راستہ تھا یعنی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دوں اور خود بھی مر جاؤں۔

بوڑھا ایلچی جواب لینے کے لیے آیا۔ اسے دیکھ کر غیرت آئی کہ اس نے پری پیکر کا چہرہ دیکھا ہو گا۔ اُس کے کانوں میں پری پیکر کی آواز پہنچی ہو گی۔ میں اس کی آنکھوں میں پری پیکر کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ وہ میری حالت کو سمجھے اور پری پیکر کے دل میں آگ لگائے۔

پوچھا "یہ عورت کتنا رنج اُٹھاتی ہے؟"

"نئی دلہن کو رنج کیسا؟" اُس نے فوراً جواب دیا

شرمندگی سے مرنے کا مقام تھا۔ آواز بھرا گئی۔ کوئی اور بات پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کاغذ اُس کے حوالے کیا اور روانہ کر دیا۔

علی قلی نے نرم لہجے میں کہا "تمہاری بیوی کی نجات کا ایک ہی راستہ ہے" ——— پھر سرفراز خاں کی طرف رُخ کیا جیسا کہ مشورہ کرنا ہو یا اجازت کا طلب گار ہو۔

اُس نے کہا "ہر قسم کی مدد دینے کے لیے تیار ہوں، فکر نہ کرو۔"

علی قلی نے کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ عمر خاں کو جنگ میں بھیجا جائے۔ اُس کام کے لیے روسی افسر بہانہ کرنے کے لیے حاضر ہیں۔"

سرفراز یہ سُن کر متفکر ہُوا۔ ایک لمحہ کے بعد کہا "کوئی عیب نہیں۔ میں رضامند ہوں۔"

دوسری صبح علی قلی روسی افسر پالکو نیک کی ملاقات سے واپس آیا اور کہا "کام ہو گیا" ——— عمر خاں کو دس روز تک جنگ میں بھیجا جائے گا۔ پالکو نیک اِس بات سے خوش ہُوا۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے اور تمہاری بیوی کے ساتھ تمہاری مرضی کے بغیر عقد کرنے کی وجہ سے ہر ممکن مدد کرے گا۔

دل میں فریاد بلند کی کہ خدایا میری لاج رکھ۔ یہ عقد میری بیوی کی مرضی کے خلاف ہُوا ہے۔

آخر طے پایا کہ اگلے دن پالکو نیک کو ملنے جاؤں۔

——— غروب کے وقت پری پیکر کا ایلچی آیا اور خط دیا گویا میرے قتل یا آزادی کا فرمان تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا۔ لکھا تھا۔

میرے پیارے علی!

تم نے پھر بدگمانی کی۔ آج رات صبح کے چار بجے چشمے پر پہنچ

جانا تاکہ بھاگ چلیں۔ عمدہ گھوڑا لانا۔ یا مر جائیں گے یا منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔

تمہاری

پری چہر

خط پڑھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ بدگمانی سے توبہ کی۔ غور و نخوت میں خط کا ترجمہ کیا اور سرفراز خاں اور علی قلی کو سنایا۔

سرفراز خاں نے کہا "کیا یہ لازم ہے کہ تم اپنے آپ کو خطرے میں ڈالو۔ چند روز صبر کرو۔" علی قلی نے بھی تائید کی اور کہا "ابھی تم کمزور ہو۔ یہ کام مشکل ہے۔ نیز پالکونیک سے مشورہ ضروری ہے۔"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ نوکر آیا۔ ایک خط دیا۔ خط پڑھ کر علی قلی کا رنگ اڑ گیا۔ کاغذ سرفراز خاں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس نے پڑھ کر تیوری چڑھائی اور کہا ہم دو گھنٹوں تک یہاں سے چلے جائیں گے۔ اگر سلامتی چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ آؤ تاکہ اس کی جگہ پہنچا دیں۔ پالکونیک جو ہمارا دوست تھا چلا گیا۔ اب بھلا یہاں کوئی دوست نہیں!

بہتر یہی تھا کہ اُن کے ساتھ چلا جاتا، لیکن حماقت کی۔ پری چہر سے دور جانے کا خیال کون لاتا!

پری چہر کو لکھا:۔

"آج رات چار بجے چشمے پر ہوں گا!"

تمہارا

علی

سرفراز خاں کے ہاتھ چومے اور کہا کہ مجھ میں پری چہر کی جدائی کی طاقت نہیں۔ آج اِسے لیکر بھاگ جاؤں گا۔ اگر زندہ رہے تو کل صبح آپ کے لشکر میں ہوں گے۔ شاید یہ آخری ملاقات ہو۔

جلدی کی وجہ سے سب اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ روانگی کے وقت سرفراز خاں نے زمین پر ایک لکیر کھینچ کر نئے مقام کا نشان بتایا اور کہا کہ اگر ہو سکے تو ہمارے پاس پہنچنا۔ تہران جانا آسان کام نہیں ہے۔

علی قلی نے کہا ہم تمہارے تہران پہنچنے کا بندوبست کر دیں گے۔

وہ چلے گئے۔ میں تنہا رہ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پری چہر کو کیوں خطرے میں ڈالا۔ محض بدگمانی کی وجہ سے۔ اگر اس نے فرار کو آسان خیال کیا ہے تو کمالِ عشق کی دلیل ہے ممکن ہے کوئی فریب ہو، نہیں مجھے وہاں ضرور جانا چاہیئے۔ اگر نہ گیا تو کوئی اور وحشی پری چہر کو اڑا لے جائے گا۔ چاہے قتل ہو جاؤں وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ رات کو ایک بجے چشمے کے کنارے پہنچ گیا۔ گھوڑے کو ایک درخت سے باندھا اور پتھر پر بیٹھ گیا سردار تلیج کا مکان وہاں سے قریباً ڈیڑھ میل دور تھا۔ اگرچہ تاریکی میں کچھ نظر نہ آتا تھا، لیکن نظریں اُسی مکان پر جمی ہوئی تھیں۔

چار بجے کی مدت بہت طویل تھی۔ افکار کے ہجوم نے پریشان کر رکھا تھا۔ آخر اچانک دو سائے میری طرف آتے نظر آئے۔ اگر پری چہر ہوتی تو تنہا ہوتی۔ چاہا کہ بھاگ جاؤں اور جان بچاؤں، مگر پھر خیال آیا شاید اُن میں سے ایک پری چہر ہو۔ خنجر نکال لیا اور گامن کو جو حملہ کے لیے تیار تھا روکے رکھا۔ بیس قدم دور۔ ایک تو ٹھہر گیا دوسرا سایہ بڑھنے لگا۔ پری چہر کی آواز آئی۔ مجھے بلا رہی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا —— آگئی اور کہا "گھبراؤ نہیں! ابھی چلتے ہیں۔" میں نے بیتابی سے پوچھا "دوسرا کون تھا؟"

"وہی بوڑھا ہمراز ہے، فکر کی کوئی بات نہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

اُسے کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ آواز صاف تھی۔ بغل میں لینے کی جرأت نہ ہوئی —— پوچھا "کہاں جائیں؟"

کہنے لگی "ایران چلیں گے یا مارے جائیں گے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے!"

گھوڑے پر سوار ہوئے اور چل پڑے۔ ہر لحظہ یہ ڈر محسوس ہوتا تھا کہ پیچھے سوار آ رہے ہیں۔ ابھی بندوق کی آواز گونجے گی۔ کچھ سفر کیا تھا کہ آفتاب عالمتاب طلوع ہوا۔ صحرا روشن ہوا۔ لیکن دور تک کسی ذی روح کا نشان تک نہ تھا۔ دل کو تسلی ہوئی۔ پری چہر کے ہاتھ کو پکڑا، بوسہ لیا اور رونا شروع کر دیا۔

اُس کا پتھر دل رقت میں آگیا۔ کہنے لگی:

"علی! میرے لئے کتنی تکالیف برداشت کیں۔ تقدیر میں یہی تھا۔ قسمت کے آگے کس کا زور ہے؟"

میں نے کہا "اس خوشی میں کہ تمھیں دوبارہ پالیا ہے سب کچھ بھول گیا ہوں۔ اگر میری نافہمی کی وجہ سے کوئی صدمہ پہنچا ہے تو معذرت خواہ ہوں" پھر آہ بھری اور کہا،

"میں تمھارے سامنے شرمندہ ہوں"

چند منٹ خاموشی رہی۔

پھر بولی "علی جان! جو کچھ ہوا سو ہوا، اس کے متعلق کوئی بات نہ کریں۔ اب بتائیے ہم سے بڑھ کر کوئی خوش قسمت ہوگا" عاشق کا دل خوشی کے ایک حرف سے عمر بھر کی تکلیف بھول جاتا ہے۔ عشق و محبت کی باتیں کرتے جارہے تھے۔ کوئی بات یاد نہ دلائی۔ اس کی آپ بیتی سننے کی طاقت نہ تھی، لیکن اپنا قصہ سنا رہا تھا۔ وہ بڑے غور سے داستان سنتی رہی اور جزئیات پوچھتی رہی۔

پریچہر کہتی تھی رستے سے ہٹ کر ایران چلنا چاہیے۔ میں علی تملی کے وعدہ کے مطابق محافظین سرحد سے خائف نہیں تھا اور سرحد سے گزرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے دلائل پیش کئے۔ میں نے سمجھایا کہ سرحد سے عبور کرتے ہوئے گرفتار ہوئے تو روسیوں کے یہاں قید ہوں گے اور یہ کوئی خطرناک بات نہیں ہے۔ بیرامعہد کے راستے ممکن ہے کہ ترکمانوں کے ہتھے چڑھ جائیں۔ اب وہ ضرور مار دیں گے۔

کہنے لگی یہ سب صدمے تمہارے غلط خیالات کی وجہ سے اُٹھائے ہیں۔ اب میری بات مانو میں نے چند دنوں کے عرصہ میں ان راستوں سے واقفیت حاصل کرلی ہے اور غلط نہیں کہتی آخر طے ہوا کہ بیرامعہد کے راستے جائیں گے۔ چلتے چلتے ایک درے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک ٹیلے پر تھا۔ اس کے درمیان سے ایک نہر گزرتی تھی، جس کے کنارے سبزہ اُگا ہوا تھا۔ پریچہر نہر کے کنارے لیٹ گئی کہ پانی پئے مگر اُٹھ نہ سکی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے گود میں لے لیا۔ وقت اور جگہ کو بھول گیا۔ وہ سر کو میرے پاؤں پہ رکھ کر لیٹ گئی اور کہا:

"علی جان! بہت تھک گئی ہوں کچھ آرام کرنے دو"

وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور میں آسمان کو اُس کے چہرے میں دیکھتا تھا۔ پریچہر میری طرف دیکھ رہی تھی، مگر میری نظروں سے گھبراتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ شرمندہ ہے۔ گھاس کی آواز مجھے ہوش میں لائی۔ دیکھا ایک سوار ہماری طرف آرہا ہے۔ پریچہر سے کہا اُٹھو اور سوار ہوجاؤ۔ اگر میں مارا جاؤں تو تم بھاگ جاؤ اور اپنے آپ کو سرفراز خان تک پہنچاؤ۔ خود خنجر نکال کر سوار کا انتظار کرنے لگا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہی ترکمان نوجوان عمر خاں ہے۔

اُس نے آتے ہی تلوار سونت لی اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ پھر اُس نے فحش گالی نکال کر کہا "میری عورت کو کہاں لے جارہے ہو؟ میری بیوی کو تم نے خط لکھا تھا۔ چاہتے تھے کہ مجھے مار ڈالو۔ ابھی تیرا حق تیرے ہاتھوں میں پہنچاتا ہوں۔"

میرا چھوٹا سا خنجر اس کی تلوار کا کیا مقابلہ کرسکتا تھا۔ کہا "اے نوجوان! تمھاری شجاعت پر حیف ہے۔ بدترین گناہ کے مرتکب ہوئے ہو۔ تمھارے لئے اور بہت سی عورتیں ہیں۔ کسی دوسرے کی عورت پر نظر ڈالنا مردانگی سے بعید ہے۔ چوری اور بے حیائی مردوں کا کام نہیں۔ کیوں اپنے آپ کو خدا اور رسول کے سامنے شرمسار کرتے ہو۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خدا زناکار کو نہیں بخشتا۔ آخر میں بھی تمہاری طرح مسلمان ہوں یہ عورت میرے نکاح میں ہے؟"

میری باتوں سے عمر خاں متاثر ہوا۔ تلوار کی نوک زمین پر رکھی۔ ظاہر تھا کہ کسی اندرونی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اتنے میں پریچہر اُٹھی اور ترکی زبان میں کہا "اس سے عقد درست نہیں"

میں نے تصور کیا کہ غلط سنا۔ فارسی میں کہا "کیا پاگل ہوگئی ہے۔ ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔ شرم نہیں آتی؟"

وہ مجھ سے پرے ہٹ کر عمر خاں کے قریب جا پہنچی اور

پُر ملال آواز میں کہا" بہت وقت ہو چکا۔ میرا دل تجھ سے سرد ہُوا، لیکن تیرے نازک دل کی وجہ سے چھوڑنا پسند نہ کیا۔ اگر تجھ سے پیار ہے اور دوست سمجھتے ہو تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور چلے جاؤ!"

قدموں تلے زمین نکل گئی۔ غصّے میں پری چہرہ پر حملہ کیا۔ عمر خاں درمیان میں آگیا اور قریب تھا کہ اُس کی تلوار میرے سر پر پڑتی، مگر وہ اچانک گر پڑا اور تلوار ہاتھ سے دور جا پڑی۔ میں بجلی کی تیزی سے جھپٹا اور ایک ہی وار میں خنجر کو دستے تک گردن میں پیوست کر دیا۔ وفادار گامش نے پیچھے سے اُس کی ران کو کاٹ لیا تھا۔

عمر خاں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور میں دیوانوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ پری چہرہ دیوانہ وار چلّا رہی تھی" ہائے میرے جوان کو مار دیا۔ اتنے خوبصورت جوان کو مار دیا۔ میں تجھے پسند نہیں کرتی تو کتنا ظالم ہے، بے غیرت ہے" باقی فحش باتیں نہ سُنیں۔ نامعلوم کیا ہُوا۔ خنجر ترکمان کی گردن سے نکل کر پری چہرہ کے پیٹ میں پیوست تھا۔

میری آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ ہوش میں آیا تو اپنے مہیب عمل سے واقف ہُوا۔ اِدھر اُدھر بھاگا پھرتا تھا۔ آسمان اور زمین سے مدد مانگتا تھا۔ بیابان میں میری فریاد کون سنتا۔ پری چہرہ کی بالیں پر آیا۔ اُس کے پیٹ کو شال سے باندھا اور چاہا کہ سوار کر کے لے چلوں۔ اُس کی اندوہناک چیخ نکلی۔ میں نے کہا:

"تمہارے لیے جرّاح لاؤں!"

ضعیف آواز میں بولی" کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے تنہا نہ چھوڑ میرا ہاتھ پکڑ!"

ہاتھ پکڑ کر بوسہ لیا۔ آنکھیں کھولیں اور یوں گویا ہوئی۔

"علی جان اب مجھے بخش دے!"

"ہاں میری پیاری تجھے بخش دیا۔ تیرے گناہوں کو روزِ حشر اپنی گردن پر لوں گا!"

پری چہرہ قدرے مسکرائی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ایک آہ بھری اور پھر حرکت نہ کی۔

کیا کہوں مجھ پر کیا بیتی۔ اس کے گناہوں کو بھول گیا۔ ہائے بے گناہ پری چہرہ کو اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔ دیوانہ وار بیابان کی خاک سر میں ڈالتا تھا اور نالہ و فریاد بلند کرتا تھا۔

پری چہرہ کے پیٹ کو شال سے
باندھا اور چاہا کہ سوار کر کے چلوں
مگر اُس کی اندوہناک چیخ نکلی۔

جوان کی ترکمان کی گردن سے خون کا فوّارہ جاری تھا۔ ہر دو کو مخاطب کیا اور کہا" میرے اور تمہارے گناہوں کا ذمہ دار فریدون ہے۔ جب تک اُس سے انتقام نہ لوں گا، نہ مروں گا!"

پھر پری چہرہ کو آنسوؤں سے غسل دیا۔ بدن پر بیابان کے پھول چڑھائے۔

اے میری داستان کے پڑھنے والو! خُدا کے لیے پری چہرہ کو بخش دو۔ اُسے بُرا نہ کہو۔ اپنے گناہوں کی سزا اِس دنیا میں پائی۔ جیسی اِس دنیا میں آئی تھی ویسی بے گناہ اور پاک رخصت ہوئی۔ اُس کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر لیتا ہوں۔ عذاب کا مستحق میں ہوں۔

(۹)

وہاں سے رخصت ہونے کا حال خود تصوّر کریں۔ مجھ میں بیان کرنے کی طاقت نہیں۔ گامش کو آواز دی اور سوار ہو گیا۔ چند قدم جا کر رکا اور آخری بار پری چہرہ پر نگاہ ڈالی۔ دیکھا گامش پنجوں سے پری چہرہ کے چہرے سے پھولوں کو ہٹاتا تھا پھر مجھے دیکھ کر روتا تھا۔ گویا کہتا تھا میری خانم کو کیں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ آؤ مدد کرو کہ اُسے بیدار کریں اور اپنے ساتھ لے جائیں۔

کچھ دیر باہم روتے رہے اور راز و نیاز کی باتیں پری چہر کے سرد بدن سے کرتے رہے۔

پریشان حال روانہ ہُوا۔ مرنے کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ دیکھا چند سوار میری طرف آ رہے ہیں۔ تیز ہُوا کہ جلد پہنچیں اور میرا خاتمہ کر دیں، مگر افسوس علی قلی اور تیس سپاہی میری جستجو میں آئے تھے۔

دور ہی سے اپنی داستان کہہ سنائی۔ سرفراز کی آواز اور نگاہ کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ کہا

"تم دنیا کے بہت بڑے بدبخت ہو۔ تمہارے درد کا علاج موت ہے۔"

دوسرے روز کچھ سواروں کے ساتھ استرآباد پہنچا۔ وہاں سے تہران گیا۔ بھائی سے ملا۔ بہت تنگ و دو کے بعد اُسے میری گرفتاری کا علم ہُوا تھا اور نجات کی کوشش کر رہے تھے۔ فریدون کے متعلق پوچھا۔ کہا جرمنوں کے ساتھ چلا گیا ہوگا۔

پریشان حال فریدون کے گھر گیا اور رسا خانم سے ملا۔ پری چہر کے متعلق پوچھنے لگی۔ میں نے بتایا کہ راستے میں بیمار ہوئی اور مر گئی۔ اس نے کہا اس صورت میں فریدون کا خط تمہیں دے سکتی ہوں۔

(١٠)

فریدون کا خط یہ تھا:-

"میرے پیارے علی!

آرزو ہے کہ تو ہرگز اس کاغذ کو نہ پڑھے اور نہ ہی ان پُر ملال اسرار سے واقفیت حاصل کر سکے۔ میں نے ہدایت کر دی ہے کہ کاغذ اس وقت حوالے کیا جائے جب پری چہر کو چھوڑ چکا ہو۔ تیری خوشی کی خاطر اپنے آپ کو تیری دوستی سے محروم کرتا ہوں اگر ممکن ہو تو اپنے محبوب کے ساتھ زندگی عیش و کامرانی میں بسر کر۔ میں اپنی صورت کو تیرے دل میں ابد تک پلید دیکھتا ہوں۔

ان واقعات کے لکھنے سے میرا مقصد اپنی برأت نہیں ہے اپنے افسردہ دل کی تسلی کی خاطر اور تیری مرلیفی روں کے لیے لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر پری چہر پردہ الٹ دے گی اور تجھے مجبور کرے گی کہ اُس کی پست طبیعت کو دیکھے۔

جب میں نے سُنا کہ خراسان چلے گئے۔ مجھے پتا چل گیا کہ پری چہر نے کس مطلب کے لیے اس راستے کو اختیار کیا ہے، لیکن اس وقت تجھے حالات سے آگاہ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

تیرے رگ و پے میں عشق سرایت کر چکا تھا۔ کھوپڑی میں عقل نہ تھی۔ پری چہر کے سوا تجھے دنیا میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ تیرے خیالات اُس کے گرد گھومتے تھے، حتیٰ کہ اپنی شخصیت کو کھو بیٹھا تھا۔

محبت اگرچہ درد کی طبیب ہے، اگر غلط ہو تو بلا سے کم نہیں، عشق ایک چنگاری ہے جس کے بغیر دل کی بستی سرد، ویران اور تاریک ہے اور اگر یہی چنگاری بےجا سُلگ اُٹھے تو مکان اور مکیں دونوں کو بھسم کر دیتی ہے۔ تُو اپنے خیال میں پری چہر سے عشق بازی کر رہا ہے۔ اُس کی پوجا کرتا ہے، مگر اُس نے تجھے دھوکا دیا ہے اور اپنے دام میں پھنسایا ہے۔ جس روز پتا چلا کہ پری چہر نے تیرے لیے ماں باپ اور خاندان سے ہاتھ کھینچ لیا ہے میں اس کے ہر عیب کا جواز ڈھونڈتا تھا۔ میں ایسے حالات پر افسوس کرتا تھا، مگر دوستی میں دوست کی خوشی مقصود ہونا چاہیے بہرحال تیری عاقبت سے متفکر تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ ایسی عورت کافی مدت تک تیری روح کو سکون بخشے گی، کیونکہ ایک شخص سے بدنی لذت جلد خستہ اور بیزار کر دیتی ہے۔ روحانی لذت دیرپا ہوتی ہے۔

مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ پری چہر کئی ایک سے تعلقات رکھتی ہے۔ مجھے معاف کرنا حقیقت ظاہر کر رہا ہوں اور لساؤنہ کروں گا۔ اگر اس کی جدائی میں صدمہ پہنچا ہے تو دل سے اُس کا خیال نکال دے۔ مجھے یقین ہے تو نے شرافت کو عشق پر ترجیح دی ہوگی اور پری چہر کو بھگا دیا ہوگا۔ وہ مرد جو بے عفت عورت کو گھر

میں رکھتا ہے، وہ اپنی شرافت بیچتا ہے اور انسان کہلانے کا مستحق نہیں، بلکہ پست ترین حیوانات ہیں۔ ہرجائی عورت میں وفا نہیں ہوتی۔ بیوفا عورت سے عشق عشق نہیں فقط جسمانی تعلق ہے عالمِ انسانیت میں وفا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ بہر حال جو کچھ میں اس کی باتوں سے سمجھا یہ تھا کہ وہ تیرے عشق کو کافی نہ سمجھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی ہر قدم پر تحسین و آفریں سنے۔ اُس کا دل خوشی سے پھولے۔ وہ چاہتی تھی ہر روز کسی کو وصال کے بہشت میں لے جائے اور دوسرے دن ہجر میں مبتلا کر دے۔ ایسے بچے کی مانند تھی کہ اپنا چاقو ہر چیز میں چبھوئے اور پھر کھیل کو وہیں لگ جائے ——— جب مجھے اِن باتوں کا علم ہُوا بہت پریشان ہُوا۔۔۔

حقیقت تک پہنچنے کے لیے تحقیق شروع کی اور جب تسلی ہوئی تو تجھے بیدار کرنے کی کوشش کی، لیکن تو عشق میں اس قدر مست تھا کہ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہ کرتا۔ گناہ صرف عشق کا نہ تھا تو اپنی خوبیوں کی وجہ سے بہرہ اور گونگا بھی تھا۔ تو گہرے علمی مطالب سمجھ سکتا تھا، لیکن پری چہر کے سادہ کنایات کو سمجھنا تیرے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے پری چہر کے مقابلے میں اپنے آپ کو ترازو میں تولا۔ وہ آسمان پر تھی اور میں زمین پر۔ اگر حقیقت کو بے نقاب کرتا تو تجھے کب یقین آتا۔ یہی وجہ تھی کہ تجھے کہا تجھے اُس کے روبرو لے جا، تاکہ اُسے راہِ راست پر لا سکوں ——— پہلی ہی ملاقات میں شہوت و [illegible] اور شہ کے آثار اُس کے وجود میں دیکھے۔ اتفاقاً میری نگاہ میں وہ اتنی حسین بھی [illegible] بے جا تحسین و تعریف نے اسے بڑھا چڑھا دیا تھا۔

دوسری یا تیسری بار معلوم ہُوا کہ میرے گرد بھی جال بچھا دیا ہے۔ میں نے بُرا محسوس نہ کیا، بلکہ منزلِ مقصود کے نزدیک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا۔ میری بے اعتنائی سے تنگ تھی۔ جس قدر حربے فریفتہ کرنے کے استعمال کئے، بے اعتنائی بڑھتی گئی، مگر میری ٹھنڈی سانس سے اس کی حرارت تیز تر ہو گئی۔ آخر ایک روز میرے مکان پر آئی اور کہنے لگی "تم سے زیادہ کسی کو سرد نہیں دیکھا، کیا دل نہیں رکھتے؟ کیا کہوں؟" میں نے کہا

"ایک حساس دل رکھتا ہوں۔" کہنے لگی "پھر کیوں کسی وقت بھی محبت کا کلمہ تمھارے منہ سے نہیں نکلا؟ تمھاری باتوں سے تپ جلے ہُوئے دل کی بُو آتی ہے، شاید کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے!"

میں نے کہا "تم نہیں جانتی ہو کہ اِس پردے کے پیچھے کس قدر شور و غوغا ہے۔ میرے بیقرار دل میں کتنی کشمکش ہے، لیکن کیا کروں کوئی ساتھی پیدا نہیں ہُوا۔"

پری چہر ہر روز بے حیا ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن کہا "ایک عورت کو جانتی ہوں، تم پر جان دیتی ہے، بالکل ایسی ہی ہے، جیسی تم چاہتے ہو۔"

میں نے پوچھا "ایسا فرشتہ کس آسمان میں ہے؟" بولی "تیرے روبرو ہے۔" چاہتی تھی کہ گردن میں لٹک جائے، مگر میں نے اُسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور سمجھایا کہ تو آزار نہیں، تیرا وجود علی کا گرویدہ ہے، خیانت نہ کرو۔ کیا تجھے عزت اور شرافت کا پاس نہیں؟" کہنے لگی "علی کا قصور ہے، میرے سوا ہزاروں فکر رکھتا ہے۔ مجھے ایسے آدمی کی تلاش ہے جسے عشق کے سوا کوئی کام نہ ہو۔" میں نے کہا کہ "بیچارے علی کو تیرے ذکر و فکر کے علاوہ کچھ یاد نہیں۔" بولی "ہر مرد ایسا کرتا ہے، لیکن میں ایسی عادی زندگی پر قانع نہیں ہوں۔ میں نے عشق کی خاطر تمام دنیا سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور تمام عمر عشق کے پیچھے دوڑوں گی۔"

میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ [illegible] شہوت ہے۔ دماغ [illegible] ہے۔ کاش تجھے معلوم ہوتا کہ شہوت کو عشق پر قربان کرنے میں کیا لطف ہے۔ [illegible] کانٹے پھول بن جاتے ہیں۔" میری بات کو کاٹ کر کہا "اس [illegible] بات نہ کی جائے، ایک تیرے چاہنے سے میری قدر و منزلت [illegible] گی۔"

اُس دن یہی باتیں ہوئیں۔ ایک ہفتہ بعد پھر میرے گھر آئی [illegible] اماں جان باہر گئیں، مجھے تنہا دیکھ کر اظہارِ عشق کرنے لگی۔ میں نے کہا "کسی اور کو دل دے بیٹھا ہوں، اب کسی اور کے لیے جگہ نہیں۔" اُس کا رنگ اُڑ گیا، زبان بند ہو گئی۔ موقع کو

غنیمت سمجھ کر میں نے کہا "تیری نازیبا حرکات کا مجھے پورا علم ہے۔ میں جانتا ہوں تو کہاں کہاں جاتی ہے، کن کے پاس رہتی ہے۔ شرم نہیں آتی میرے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے"۔

میری طرف نگاہ کئے بغیر کہا "علی کا قصور ہے، مجھے آزاد کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ہر روز گلی کوچوں میں آزانہ پھرتی ہوں یا اُن لوگوں کا ہے جو عورتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور جان نہیں چھوڑتے"۔ میں نے کہا "علی کے سر گناہ کیوں لگاتی ہے۔ اُس نے تیرے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈالی اسی لئے ملامت کرتی ہے"۔

خلاصہ یہ کہ ہر ممکن کوشش کی راہ راست پر لاؤں، اگر بے سود کوشش سے فائدہ؟ کاش تو یہ باتیں سن سکتا اور پری چہر سے باز آتا۔ بیہودہ کوشش کرتا رہا کہ فاسد عورت کو راہِ راست پر لاؤں۔

پری چہر میرے دامِ محبت میں گرفتار ہو چکی تھی اور قسم کھا کر کہتی تھی کہ اُس نے دوسروں سے تعلقات منقطع کر لیے ہیں، حتّٰی کہ سلطان مہدی خان ایسے دوست کو خیرباد کہہ چکی ہے۔

آخر اُس روز تم میرے مکان پر آئے۔ تمھاری آمد سے ایک گھنٹہ پہلے پری چہر پریشانِ خاطر آئی اور کہا "جو چاہتے ہو کہو۔ علی سے مجھے ہرگز محبت نہیں رہی۔ اگر تم میری طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاؤ گے تو علی کو چھوڑ دوں گی اور خراسان میں سلطان مہدی خان کے پاس چلی جاؤں گی"۔ ضمناً مجھے تنبیہ کی کہ اگر میں نے شکایت کی تو وہ میرے خلاف تہمت لگائے گی اور علی کو خبردار کر دے گی۔

میں مسکرایا، کیونکہ یہ محال تھا کہ تُو میرے حق میں ایسا گمان کرے۔ میری ہنسی ختم نہ ہوئی تھی کہ تجھے روبرو دیکھا۔ اقرار کرتا ہوں کہ تم بیحد پریشان ہوئے۔ میں اپنے آپ میں گم تھا، ورنہ حقیقتِ حال سے آگاہ کرتا۔ اگرچہ گمان نہیں کہ تم اعتبار کرتے۔

لیکن تمھیں اس حد تک بے انصاف نہیں کہتا۔ دس ہزار تومان جو تو نے میرے سامنے ڈال دیئے۔ میری روح کو خستہ کر دیا۔ اپنے دو ہزار اٹھائے۔ باقی تمھارے نام بنک میں جمع کرا دیئے۔ خیال تھا کہ جب تمھاری آگ فرو ہو گی تو خود آ کر تمھاری آنکھوں سے پردہ ہٹاؤں گا۔

جب سُنا کہ دونوں خراسان چلے گئے ہیں، خوش وقت ہُوا۔ یقین تھا کہ وہاں پری چہر سلطان مہدی خان کے پاس چلی جائے گی اور تمھیں اپنے ناپاک وجود کے شر سے آسودہ کرے گی...

میرے پیارے علی! میں حالِ دل کہنا چاہتا تھا، مگر جرمنوں کے ساتھ جانے کا حکم ملا ـــــــ اے کاش ملاقات ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے اِس جنگ سے زندہ واپس نہیں آؤں گا۔ وطن کی خاطر جان قربان کرنے جا رہا ہوں۔ تجھے خُدا کے حوالے کرتا ہوں۔"

تمہارا دوست

"فریدوں"

یہ خط پڑھنے کے بعد فریدوں کی دوستی اور بے گناہی پر یقین ہو گیا۔ تمام مال و اسباب فریدوں کی بہن اور بھائی حسین کے حوالے کیا۔ دونوں کی شادی بھی کر دی۔ پھر فریدوں کی جستجو میں تمام یورپ چھان مارا، مگر نشان نہ پایا۔ بعض کہتے ہیں، مارا گیا۔ اُسی کی تلاش میں سرگرداں ہوں"۔

یہ سرگذشت پڑھنے کے بعد میں غور کرنے لگا کہ اگر ہماری تمام خوشیاں عشق و وفا سے ہیں تو مصائب کی وجہ بھی بے جا عشق اور بیوفائی ہے۔

جب علی کی بالیں پر پہنچا تو نزع کی حالت طاری تھی۔ میں نے اُس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور محبت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا، پھر دونوں آنکھیں بند کر لیں اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔